سب رس

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

چاند سلطانہ

"اِدارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیرِ ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

جلد (۱) شمارہ (۸) اگست ۱۹۳۸ء

فہرستِ تصاویر

فہرستِ مضامین

اِدارِیہ

ادارۂ ادبیات اردو کی جدید تنظیم

"ادارۂ ادبیات اردو" سے متعلق ہم نے گذشتہ شمارہ میں بعض باتیں لکھی ہیں۔ اب اس کے مقاصد قواعد اور معلومات ایک کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ادارہ" کی مجلس مؤسسین نے "ادارہ" کی جدید تنظیم میں غور و فکر سے کام لیا ہے۔ ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والا شان نواب اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار ہیں۔ ہز ہائنس کو جو علمی و ادبی ذوق ورثہ میں ملا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اس لیئے "ادارہ" کی آپ سے وابستگی نے بڑی خوش گوار توقعات پیدا کر دی ہیں۔ ہز ہائنس کے بعد سرپرستوں میں ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ بہادر ثالث اور راجہ شام راج راجونت بہادر کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قدر دانِ علم و ادب ہیں۔ سر اکبر حیدری کے اردو دنیا پر احسانات کا ایک عملی ثبوت جامعہ عثمانیہ ہے جس کی تاسیس میں انھوں نے انتہائی کوشش فرمائی تھی۔ نواب سالار جنگ بہادر قدیم دکنی ادبیات کا اپنے بیش بہا کتب خانہ میں ایک نایاب ذخیرہ رکھتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ صرف کتب خانہ کی الماریوں میں بند نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی اشاعت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ راجہ شام راج راجونت بہادر حیدر آباد کے ایک قدیم باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو علم و ادب کا اچھا ذوق ہے۔ "ادارہ" کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر نے قبول فرمائی ہے۔ نواب صاحب خوش ذوق وسیع النظر اور علم و فضل کے مالک ہیں۔ ان کی رہنمائی میں "ادارہ" کی غیر معمولی ترقی یقینی ہے۔

ادارہ کے معاونین بھی اہل ذوق اور علم دوست اصحاب ہیں، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، مولوی عبدالرحمن خاں صاحب مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب، مولوی سید اطہر حسین صاحب، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، حضرت امجد، مولوی قاضی محمد حسین صاحب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب، مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب مولوی سید علی اکبر صاحب، راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی، مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی خورشید علی صاحب، مولوی مرزا احمد بیگ صاحب، ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب، محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ اور مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کی معاونت اور ادارہ کے مؤسسین، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی عملی دلچسپی سے یقین ہے کہ ادارہ کی بڑھتی ہوئی ترقی میں برق رفتاری پیدا ہو جائے گی۔

ادارہ نے مستند علمی و ادبی خدمات اور ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں عملی ہمدردی کے اعتراف میں بعض اصحاب کو "رفیق" منتخب کیا ہے۔ یہ ایک اچھی ابتدا ہے، اور اس کا ارادہ ہے کہ ہر سال کے ختم پر وہ اسی طرح مجلس رفقا کی فہرست میں اضافہ کرتا رہے گا، اس سے ایک طرف تو ادارہ نے اپنا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف خدمت کا احساس رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اب تک ادارہ نے ان اصحاب کو رفیق بنایا ہے:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ڈاکٹر قاری

کلیم اللہ صاحب، ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب ہاشم، مولوی سید محمد صاحب، مولوی سید محمد اکبر صاحب وفاقانی، نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب، مولوی میر حسن صاحب، مولوی مخدوم محی الدین صاحب، مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی میر سکندر علی صاحب وجد مسٹر راگھویندر راؤ جذب، محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، مسٹر مہندر راج سکسینہ اور میکش۔

"ادارہ" کے قواعد وضوابط اسی شمارہ میں کہیں دوسری جگہ شائع کئے جارہے ہیں۔ ہر صاحب ذوق کو ان کا مطالعہ کرکے یہ سوچنا چاہیئے کہ اسے اس ادارہ کی سرپرستی اور معاونت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ غور وفکر کے یہ لمحے انھیں ضرور "ادارہ" کی طرف متوجہ کرکے رہیں گے اور جو اصحاب سرپرستی اور معاونت قبول نہ کرسکتے ہوں وہ کم از کم رکن بن کر ادارہ کی مطبوعات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ماضی کے کارنامے مستقبل کے لئے "یوم ولی" کے بعد ہی دکن کے قدیم ادب کی تحقیق اور اشاعت کے لئے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب ہیں، نائب صدر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، معتمد مولوی سید محمد صاحب، نائب معتمد نواب سعادت علی صاحب رضوی اور اراکین مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری اور پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ یہ انجمن بڑی محنت سے قدیم دکنی کتابوں کو ترتیب دے رہی ہے۔ چنانچہ اب تک کوئی پچیس کتابیں مرتب اور طبع کی گئی ہیں جو عنقریب شائع ہوجائیں گی۔

اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ محمد قلی قطب شاہ بانی حیدر آباد کے اُردو دیوان کی طباعت ہے۔ اس کی ضخامت کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں نہ صرف عاشقانہ شاعری ہی کا رواج تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ فطری شاعری کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کے دیوان میں سیکڑوں ایسی نظمیں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ کلیات عبداللہ قطب شاہ، نصرتی کی کتابیں گلشن عشق اور علی نامہ، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، شاہ برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اور سکھ سہیلا، صنعتی کا قصہ ابو تمیم انصاری، عیدل کا ابراہیم نامہ اور مثنویات شاہ سراج اورنگ آبادی مرتب اور طبع کی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں کے ساتھ دکنی الفاظ کی فرہنگ اور یادداشتیں شائع کی جارہی ہیں۔ جن لوگوں کو تحقیق و تدقیق کا ذوق ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کام کس قدر وقت طلب ہے، لیکن نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی اور مرتب کرنے والوں کے ذوق عمل نے اس کو آسان کردیا ہے۔ بلاشبہ اُردو ادب پر اس انجمن کا ایک احسان عظیم ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے اُردو دنیا میں نئے انکشافات کا رونما ہونا یقینی ہے۔

ایک کروٹ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی تھی لیکن اس سال پھر اس نے اپنی کروٹ بدلی ہے اور زندگی کا ثبوت دیا ہے ـــــ اُس محوخواب کی طرح جو ایک احساسِ بیداری کے ساتھ چونک اٹھتا ہے ـــــ لیکن صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آئے تو اُسے بھولا نہ سمجھنا چاہیئے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک زمانہ تک ملک کے تعلیمی مسائل میں گہری دلچسپی لی تھی اور اس کی دلچسپیوں کے آثار اب بھی عملاً موجود ہیں۔ اس کی تحریکات کی

نواب سالار جنگ بہادر

خاص وقعت تھی اور ان میں سے اکثر ملک کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بر وقت پیش کی جایا کرتی تھیں۔

کام کے وقت کسی ایک پر بھروسہ کر لینا اور ناکامی کے وقت کسی ایک کے سر تمام الزامات تھوپ دینا' دنیا کا دستور ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے جمود کے متعلق بھی " شکوہ و شکایت " کا ایک دفتر کھل گیا۔ ارباب کانفرنس اگر برا نہ مانیں تو ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کانفرنس کا سارا نظام ایک ہی مرکز پر کار فرما تھا؟ اگر کسی ایک فرد نے اس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لی تو ساری ملت کیا اس ایک فرد کے تغافل میں گم ہو گئی ــــ کسی کو سوتا ہوا دیکھ کر یہ ضروری نہیں کہ تمام جاگنے والے اپنے سر پر لحاف ڈال لیں بات یہ ہے جب اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے تو لوگ دوسروں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو' اس سال پھر یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس کی گذشتہ اہمیت کے پیش نظر ہم نے سب رس کا ایک حصہ اس کے لئے خاص طور پر وقف کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کانفرنس بہت جلد اپنی گذشتہ عظمتیں حاصل کر لے گی' اور اس کی رگ و پے میں وہی خون عمل موجزن ہو جائے گا جس نے اس کو ایک " زندہ ادارہ " کی طرح کار فرما رکھا تھا۔

دو نئی کتابیں

ادارہ ادبیات اردو نے دو نئی کتابیں شائع کی ہیں ــ نقد سخن اور گریہ و تبسم۔ نقد سخن' کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر کی سخن ورانہ تنقید ہے۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں تنقید کی اہمیت ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر نقادوں نے تنقید اور ذاتیات کی حدیں ملا دی ہیں' اور جب کبھی وہ تنقید کرتے ہیں تو ان کی نظروں کے سامنے " کیا لکھا " کا سوال ضمنی بن جاتا ہے اور " کس نے لکھا؟ " ان کے ذوق تنقید کا موضوع بن جاتا ہے۔ خلوص اور عداوت کے جذبات میں بہہ کر وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں جو بہ حیثیت دیانت دار نقاد کے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ نواب عزیز کی یہ تنقید بڑی حد تک اس عیب سے پاک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم نواب عزیز کے اُن تمام اعتراضات سے متفق ہوں جو انھوں نے کلام فانی پر کئے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص ان سے اتفاق کرے۔ یہ تنقید پبلک ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق ایک عام بحث شروع کی جائے۔ اسی خیال کے تحت ہم نے " سب رس " میں نواب عزیز کی تنقید کا جواب اور ان کی جانب سے اس کا جواب الجواب شائع کیا تھا۔

اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کھوٹے کھرے کا صحیح اندازہ قائم کیا جا سکے۔

" گریہ و تبسم " مدیر سب رس کی نظموں کا مجموعہ ہے اس کے " حسن و قبح " کے متعلق اس کے پڑھنے والے ہی رائے دے سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے' شباب کے تبسم کی یہ چند لہریں اور مرتعش دل کی ٹھیس سے بہنے والے آنسوؤں کی یہ چند بوندیں ــ محض جذبات اور احساسات کا سرمایہ ہیں جن کو " فن اور ادب " سے کوئی تعلق نہیں۔ " گریہ و تبسم " اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ دل کی آواز ہے اور اگر اس نے دلوں پر اثر کر لیا تو اس کے ہزاروں عیب' اس کی اس ایک خوبی میں دب کر رہ جا سکتے ہیں۔

خوش گوار تاثرات

گذشتہ مہینے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب صدر شعبۂ عربی جامعہ دہلی' ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی

صدر شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی، مولوی سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ اور مولوی شاہد احمد صاحب بی اے مدیر ساقی دفتر "ادارۂ ادبیات اردو" پر تشریف لائے اور دفتر "سب رس" کا بھی معائنہ کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ اچھے اثرات لئے ہوئے گئے۔ ان چاروں اصحاب سے جو خدمت گزاران علم و ادب ہیں اردو کے مستقبل جدید ادب کے رجحانات اور اسی قسم کے بعض دوسرے مسائل پر تبادلۂ خیال کرکے ہمیں مسرت ہوئی۔

"خیر جاریہ" عربی ادبیات کی وسعت اس کی بلندی اور لطافت اور سب سے بڑھ کر اس کی غیر فانی زندگی اس قابل ہے کہ مشرق اس کی جانب خاص طور پر توجہ کرے۔ ہم ہر چیز کے ایک ہی رخ کو دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں مغربی ادبیات کی افادیت مسلم لیکن ہم اپنے لٹریچر سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ اس کے جوہر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

دائرۃ المعارف، جس کے سالانہ اجلاس حال ہی میں ختم ہوئے ہیں عربی ادبیات کی اشاعت کے لئے اعلیٰ حضرت غفران مکاں کی سرپرستی میں نواب عماد الملک مولانا عبد القیوم اور نواب فضیلت جنگ کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس دائرہ کا کام عربی ادب کی اشاعت ہے۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عہد مبارک میں اس دائرہ نے بڑی ترقی کی ہے اور خوش قسمتی سے اس کے صدر سر اکبر حیدری اور معتمد نواب مہدی یار جنگ بہادر ہیں۔

اس سال فرخندہ بنیاد میں اس دائرہ کے سالانہ اجلاسوں کی وجہ سے بڑی علمی چہل پہل رہی۔ اکثر علماء و فضلاء بہ حیثیت سرکاری مہمان یہاں آئے اور اپنے علم وفضل سے اہل حیدرآباد کو مستفید کیا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا افتتاح اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے ایک گراں قدر پیام سے ہوا جس میں ارشاد ہمایونی ہوتا ہے کہ

"مجھے بہت مسرت یہ سن کر ہوئی کہ اس مرتبہ مجلس دائرۃ المعارف کا ایک سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا ہے جس میں علوم عربیہ کے متبحر عالم ہندوستان کی مشہور جامعات اور دیگر علمی اداروں سے آکر شریک ہونے والے ہیں۔ پس میں امید کرتا ہوں کہ ان کی قیمتی معلومات سے دائرۃ المعارف کے کارکن نیز ہماری جامعہ عثمانیہ کے عربی شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ مستفید ہوں گے اور دوسری طرف یہ علما خود ہمارے دائرۃ المعارف کی تحقیق اور تصحیح کے کام کو دیکھ سکیں گے جس کی بدولت حیدرآباد کو علوم عربیہ میں ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور جس کی شہرت نہ صرف بلاد اسلامی میں بلکہ یورپ کے اکثر حصوں میں پھیل گئی ہے، یہاں کے سربرآوردہ مستشرقین اس کام میں ہمارے علماء کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ آخر میں، میں امید کرتا ہوں کہ یہ نیک اور خالص علمی کام ایک خیر جاریہ کی طرح ہمیشہ برقرار رہے گا"

سر اکبر حیدری نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں دائرۃ المعارف کے کاموں کا مختصراً تعارف کرایا۔ اور آپ نے کہا کہ "مصر سے جامعہ ازہر کے ایک وفد نے جو حال ہی میں حیدرآباد آیا تھا اس مجلس کا تفصیل سے معائنہ کرنے کے بعد نہ فقط اس کے طریق کار کی تحسین کی بلکہ یہ بیان کیا کہ گو کہ مصر میں بھی قدیم کتابیں شائع ہوتی ہیں مگر مجلس دائرۃ المعارف کے پیش نظر جو علمی تحقیق اور احیاء علوم ہے، وہ اس کو دوسرے اس قسم کے اداروں سے ممتاز کرتی ہے" آپ نے اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

جشن سیمیں شاہانہ کی تقریب میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کو اس مجلس کے مطبوعات بھیجی گئیں فرمایا کہ "انڈیا آفس کے مشہور کتب خانہ نے بھی بعض کتابیں حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ ہندوستان کے بھی اکثر مشہور کتب خانوں سے فرمائشیں آتی رہی ہیں، اور یورپ کے بھی اکثر مستشرقین نے ان مطبوعات کی تعریف کی ہے۔"

ان اجلاسوں میں شرکت کے لئے جو حضرات باہر سے تشریف لائے ان میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شمس العلما، مولانا عبدالرحمان صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب، ڈاکٹر داؤد پوتا صاحب، ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم دائرۃ المعارف کے سالانہ اجلاس کی کامیابی پر نواب مہدی یار جنگ بہادر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ایک لائق باپ کے لگائے ہوئے پودے کو تناور بنانے میں ایک لائق فرزند کی مخلصانہ کوشش یقیناً لائق مبارکباد ہے۔

کچھ اپنے متعلق

گذشتہ شمارہ صرف (۶۴) صفحات پر شائع کیا گیا۔ اگرچہ یہ "سب رس" کے قواعد کے خلاف نہیں، تاہم ہماری گذشتہ شش ماہی روایات کے پیش نظر ایک کمی ضرور تھی جس کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن "اقبال نمبر" کے سلسلے میں غیر معمولی مصروفیات نے ہمیں اس شمارہ کی ترتیب کے لئے کم مہلت دی اور ہم نے پابندی وقت کی خاطر چند صفحات کی قربانی گوارا کرلی۔ اس کے علاوہ جب ہم محرم نمبر اور اقبال نمبر کی ضخامت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے بڑی حد تک قبل از قبل اس کمی کی تلافی کر دی تھی۔

"اقبال نمبر" کے انعامی مضامین اور نظموں کا تصفیہ اس وقت ہوا جب کہ جولائی نمبر شائع ہو چکا تھا۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ حسب ذیل مضامین کے لئے انعامات کا اعلان کرتے ہیں:—

کلام اقبال میں رجائیت کا عنصر از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب ولی داد خاں صاحب منددزی)
اقبال (نظم) از حضرت علی اختر اختر حیدرآبادی (انعام عطیہ صاحبزادہ اشرف بی۔ اے)
اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی از ح انصاری متعلم رزیڈنسی ماڈل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد)
دوستوں کا مکالمہ از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین صاحب انصاری)
محسن قوم اقبال (نظم) از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب)

سب رس کے حالیہ شمارہ کا ایک حصہ ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ اس کانفرنس کے متعلق معلومات آفرینی کا ذریعہ بن سکیں گے۔

اس نمبر میں نواب سالار جنگ بہادر کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ نواب صاحب معزز امرائے حیدرآباد میں نہ صرف تمول کے اعتبار سے ایک خاص درجہ رکھتے ہیں بلکہ آپ میں مشرقی امارت کی بعض اچھی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اب جب کہ قدیم زمانہ کے امیروں کی علمی سرپرستیاں، افسانوں کی طرح سنائی جاتی ہیں، آپ کا وجود مغتنمات سے ہے۔ نواب صاحب قدیم دکنی کتابوں کو اپنی سرپرستی میں شائع کروا رہے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل فراموش احسان ہے جس کے بوجھ سے

رہتی دنیا تک اُردو کی گردن خم رہے گی۔

چاند بی بی کی تصویر جو سکندر علی وجد کی نظم کے سلسلہ میں شائع کی جارہی ہے نواب صاحب کی عطیہ ہے۔ یہ تصویر نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اپنی ندرت اور نفاست کے اعتبار سے حسن کاری کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم حضرت کیفی مرحوم اور مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کی تصویریں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں شائع کی جارہی ہیں۔ مولوی محمد مرتضیٰ اور حضرت کیفی اس کانفرنس کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب اس کے ابتدائی کارکنوں میں سے ہیں اور اس سال اس کانفرنس کے صدر ہیں۔ اول الذکر اور آخر الذکر حضرات کے متعلق مستقل مضامین بھی شائع کئے جارہے ہیں۔ حضرت کیفی کا نام ایک شاعر کی حیثیت سے تمام اردو داں طبقہ میں مشہور ہے لیکن غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے زمانہ میں ملک کے ایک بڑے قومی خدمت گزار بھی تھے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کا بڑا درد تھا اور وہ ان کی ترقی میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے تھے۔

میکش

"واردات"

مرے حبیب! یہ تاکیدِ ضبطِ غم کیسی
تجھے یہ فکرِ فراموشیٔ کرم کیسی

خیالِ ترکِ وفا ہی سے کانپ جاتا ہوں
سنبھال اے غمِ الفت کہ لڑکھڑاتا ہوں

بس ایک دھن ہے اسی دھن میں گائے جاتا ہوں
ترا سکوتِ وفا آزمائے جاتا ہوں

یہ جانتا نہیں کس سمت جارہا ہوں میں
ہے اتنا ہوش کہ تجھ کو بُلا رہا ہوں میں

خدائے عشق کو اپنا بنا رہا ہوں میں
تُو مجھ سے دور ہے نزدیک آرہا ہوں میں

رواں دواں ہوں کہیں اب مجھے قیام نہیں
یہ بیخودی مری پابندِ صبح و شام نہیں

جو اس کے سجدوں کو مل جائے پائے ناز ترا
خوشی سے جان ہی دے دے غریب ساز ترا

صمد رضوی ساز

ظریف اور ظرافت

ظریف (جسے عوام الناس مزاح نگار کہتے ہیں) بننے یا کہلانے کا روگ عموماً ایسے شریف لوگوں میں پایا جاتا ہے جنھوں نے اصل خیر سے صرف مڈل تک تعلیم پائی ہو۔ اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر افسانہ نویسی شروع کر رکھی ہو۔ اور افسانے بھی وہ افسانے کہ ارے معاذ اللہ! نہ توبہ! ماشاء اللہ! ایسے گرما گرم ۔ اتنے مزیدار اور اس قدر چٹ پٹے کہ ایک بار اگر کوئی پڑھ لے تو پھر مرتے دم تک افسانوں سے طبیعت بیزار رہے ۔ ایسے گراں پایہ اہلِ قلم جب افسانہ نویسی کے میدان میں خم ٹھوک کر اترتے ہیں تو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بدولت اور نہیں تو "فسانہ آزاد" کے ایک بار "خوجی" تو ضرور بن جاتے ہیں اور خدا سلامت رکھے ہمارے مدیر حضرات کو جو ایسے باکمالوں سے اکثر "بالسٹرین" کا کام لیتے ہیں

حکیم لقمان نے بوستاں میں ایک مزاح نگار کی جو تعریف لکھی ہے پہلے وہ سن لیجئے اس کے بعد پھر کچھ اور عرض کریں گے ۔

ظریف حقیقت میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے دیکھتے ہی ایک صاحبِ عقل و ہوش کو ہنسی آجائے ۔ (اگر کوئی رو بھی دے تو کچھ مضائقہ نہیں) قد و قامت کے لحاظ سے قطب صاحب کی لاٹھ کے برادرِ خورد معلوم ہوں کلّے "طوطا پری" آم کی یاد تازہ کرتے ہوں چہرے پر ہوائیاں (آتشبازی کی ہوائیاں نہیں) اُڑ رہی ہوں۔ اور لباس زبانِ حال سے صورتِ بیں حالتِ مپرس کی داستان کہہ رہا ہو۔ اور چال کا یہ ڈھنگا پن دیکھ کر راہ چلتے بھی ذرا پلٹ کر دیکھ لیں ۔ چنانچہ اگر تجربہ واقع ہوئی ہے تو صحافتی منڈی میں مانگ بھی زیادہ ہوگی اور جو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح جس پر سے چھلکا اتار لیا گیا ہو صاف اور ملائم ہے تو وہ قطعی مزاح نگار ہے۔ اور اس کی شہرت کا چاند اس طرح چمکے گا جیسے مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ یا آسمانِ ادب پر اس طرح درخشاں نظر آئے گا جیسے کسی مشکیں نسب محبوبہ کے کان میں بنارس کے بنے ہوئے بادلہ کے آویزے ۔ جو پونے تین آنے میں جوڑی ملتی ہے

تو جناب! یہ واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں شریف آدمیوں پر ہنسی کا دورہ صرف اس وقت پڑتا تھا جب وہ اپنے کسی ہم جنس میں کوئی ایسی چیز دیکھ پاتے جو بادی النظر میں انوکھی یا غیر مانوس سی معلوم ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس وقت جناب ابنِ آدم شکل و صورت میں "ستر پوشی" کے معاملے میں کوئی ایسی اختراع یا ایجاد فرما لیتے ہوں گے جو ہنسی کی محرک ہوتی ہوگی جس طرح آج کل ایک "راس مرد" مونچھیں منڈوا کر عقل سے فارغ البال ہو جاتا ہے اور بیوقوف لوگ اس شریف آدمی کی "مستورانہ" شکل دیکھ کر صرف معذرت کے طور پر مسکرا دیتے ہیں ممکن ہے کہ گئے وقتوں میں بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسی ہی ناشدنی حرکات کا مرتکب ہوتا ہوگا جو دیکھنے والوں کے لئے ہنسی کا باعث بن جاتی ہوں گی ۔

اور یہ تو ایک مشہور تواریخی واقعہ ہے کہ ہنسا مدت تک محض ایک قسم کا مرض ہی متصور ہوتا رہا ہے ۔ اور جو یقین نہ ہو تو ہندوستان کی کوئی جدید تواریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں قطب صاحب کی لاٹ کے بارے میں سب سے زیادہ پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ ہندوستان میں آٹھ سو سال تک مہاسبھائیوں نے مسلمانوں سے جو "رگڑے" کھائے ان کی فریاد برہما تک پہنچانے کے لئے ڈاکٹر ڈنڈا پرشاد اور بنارسی پنڈت جی مہاراج کی کوششوں سے یہ لاٹ تعمیر کی گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ "کسی مذہبی مزاحیہ" کے وصال میں جنھوں نے اپنے یہاں جنت البقیع بھی بنوا رکھی تھی پہلے آسمان پر بڑے بڑے مہاپرشوں اور علاموں کی ایک مجلس حضرت کو "برین عقل و دانش" پر داد دینے کے لئے منعقد ہوئی لیکن نوریوں کو خاکیوں کی اس جسارت پر حیرت سی ہو رہی تھی اور چپکے چپکے آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں جناب عزرائیل بھی کہیں سے آنکلے اور سن کر بولے لو دیکھ لو ؎

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں　　　شوخ و گستاخ یہہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

یہہ سنتے ہی ایک طرف سے "الحق" کا نعرہ بلند ہوا اور ؎ کہا منصور نے خدا ہوں میں ۔

پاس سے :- بولا ڈارون کہ بوزینہ ہوں میں

یہہ سن کر :- ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　　فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست !

غالباً سیماب تھے ۔

تو جناب جس طرح مہاشہ ڈارون جی کے نقطۂ نظر سے بندر شکل بدلتے بدلتے ارتقائی قلابازی سے انسان بن گیا اسی طرح حکیم لقمان کے نظریہ کے مطابق ہنسی جو محض ایک قسم کی بیماری تھی عادت بن گئی ۔

رہا ڈارون کا نظریہ ! تو ممکن ہے کہ آپ کی قوم پہلے بندر ہی ہو لیکن بندر "ضاحک" نہیں ہوتا اور ابنِ آدم ضاحک ہے ۔ اور وہ بھی پیدائشی اس لئے اگر کوئی سیلانی طبعیت کے بزرگ سیر کرتے کرتے کہیں عدم میں جانکلیں تو ڈاروں سے مل کر ہمارا اعتراض ضرور پیش کر دیں ۔ ہم رمضان میں استیصالِ ثواب کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس کسی بے روزہ دار کو پلا دیں گے ۔

پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ بعض لوگوں نے ہنسانا اپنا پیشہ بنا لیا ۔ ایسے لوگ ابتدا میں ہندوستان میں بھانڈ اور یورپ میں فُول یا جسٹر کہلانے لگے ۔ اور جب تعلیم کا دور دورہ ہوا تو ڈارون کے نظریہ کے مطابق یہی فُول یا جسٹر ترقی کرتے کرتے "ہیومرسٹ" بن گیا اور اس نے لاکھوں کمائے ۔ اب رہا ہندوستان، تو جناب ! اول تو کسی نے اس فن کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی لیکن جب اوروں کی دیکھا دیکھی کچھ غیرت آئی بھی تو وقت گذر چکا تھا یعنی :- باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا

اور اس کی بجائے :- اب بحث میں اردو ہندی ہے قربانی ہے یا جھٹکا ہے

غور کا مقام ہے کہ جب صورتِ حال اتنی خوشگوار ہو اور ملک کا ملک دوسروں کے لئے مکمل مذاق اور سامانِ ظرافت بن رہا ہو تو مزاح نگاری کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے ۔ مغرب میں تو لوگ ادبی ظرافت کا لطف اٹھاتے ہیں اور ہم ہندوستان والے عملی ظرافت کی داد دیتے ہیں ۔ آپ پیپل پر کلہاڑا چلائیے تو دوسرا آپ کی گردن پر کلہاڑا چلائے گا، آپ گائے ذبح کیجئے تو کوئی آپ کو ذبح کرنے اٹھ دوڑے گا ۔ ظرافت کا لطف تو صرف ہم ہندوستان والے ہی کچھ اٹھاتے ہیں ۔ یورپ والوں کی بات ہی جانے دیجئے ۔

چہ داند بوزینہ لذاتِ ادرک

ایم اسلم

سیرتِ سلطانی

جب ہوئی مسجدِ اعلیٰ کی مکمل تعمیر — یادگارِ حشم حضرت سلطان ٹیپو !
کون؟ وہ شانہ کشِ کاکلِ آئینِ کہن — فرق مذہب میں نہ آنے دیا جس نے سرمو
جس کی ہستی تھی رخِ دینِ نبیؐ کا غازہ — جس نے معشوقۂ ملت کے سنوارے گیسو
گلِ رعنائے گلستانِ رسولِؐ اکرم — سارے عالم میں تھی پھیلی ہوئی جس کی خوشبو
شہ شیر افگن و جم جاہ و سکندر سطوت — نصب تھے جس کی صف آرائی کے "رن کھم" ہر سو
رزم گاہوں میں صفِ کفر الٹ دیتی تھی — اُس کی ہلکی سی بھی ایک جنبشِ تیغ ابرو
عرض کی میر عمارت نے یہ سلطاں کے حضور — حسبِ فرماں ہوئی تعمیل بہر یک پہلو
افتتاح کیا ایک جشنِ شہِ والا نے — تھے ہزاروں علماء گھر میں خدا کے مدعو
مشورے سے یہ ہوا طے وہ بنے پہلے امام — ہو اگر "صاحبِ ترتیب" بصد شانِ علو
یعنی جس نے نہ قضا کی ہو صلواۃِ خمسہ — عمر بھر جس نے کیا ہو نہ کوئی ترک وضو
سن کے یہ عالم و مفتی و مشائخ، صوفی — بن کے تصویرِ خجالت نگراں تھے ہر سو
شہ نے فرمایا کہ "وہ صاحبِ ترتیب ہوں میں — للّٰہ الحمد وہ بندہ ہوں کہ جس میں ہے یہ خو
پھر بڑھا بہرِ امامت وہ مجاہد وہ جری — وہ شہیدِ رہِ مولا وہ حرم کا آہو
کیوں نہ ان پر ہوا ئے مشتاق خدا کی رحمت — بادشاہی میں بھی رکھتے تھے جو دل پر قابو

نوٹ: "مسجد اعلیٰ" جس کی افتتاحی رسم کا واقعہ منظوم ہوا ہے۔ آج تک اپنے شاندار بلند میناروں کے ساتھ قلعہ سرنگاپٹم میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کی علو ہمتی اور زہد و تقویٰ کی شہادت دے رہی ہے

ابوالخیر مشتاق قریشی (بنگلوری)

مرکزِ خیال

(۱) دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم (سعدی) ←
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے (غالب)

(۲) بوئے یار من ازیں سست وفا می آید
ساغر از دست بگیرید من از کار شدم (نظیری) ←
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سودا)

مرسلہ سکینہ بیگم

محبت میں فتح و شکست

محبت کے برق رفتار بازو، ہمیں مسرت و انبساط کے ساتویں آسمان پر لے اڑتے ہیں، یہ فضا انتہائی سنسنی خیز و خمار آگیں ہوتی ہے۔ اس وقت رومانی خوابوں کے ایام بہار ہم پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔

لیکن ساغرِ محبت سے جرعہ کشی کے بعد — ناکامی و حرماں نصیبی! آہ! ایک جگر سوز و جانگداز المیہ ہے۔

خلدِ بریں کی ٹھنڈی و معطر ہواؤں میں سانس لینے، کیف آور و مدہوش کن ماحول میں بسر کرنے کے بعد، کوئی خود کو شکست و ناکامی کے خونخوار و آتشیں پنجہ میں گرفتار محسوس کرے، یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس میں قلبِ حساس و روحِ لطیف کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

یہ ایک تجربہ ہے جو تمہیں اعلیٰ و ارفع منزل پر پہونچا دے گا، یا قعرِ ذلت میں دھکیل دے گا۔ ان دونوں کیفیات کا انفرادی صلاحیت پر انحصار ہے۔ اس مہلک ناکامی و محرومی کے تاثرات برداشت کرنے کی سکت، اگر تم میں موجود ہے، تو تمہیں جو سبق ملا وہ بیش بہا ہوگا۔ اور اگر تم نے کشمکش و پیکار سے تمام ہتھیار ڈال دیئے، درد و اضطراب، سوز و گداز جس کی شدت کبھی ناقابل تحمل ہو جاتی ہے، اس سے دلیرانہ مزاحم ہونے کا اپنے میں قوی ارادہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں شاید تباہی و بربادی تمہارا انجام ہے۔

تم نے محبت کی — اپنی ہستی کامل و تمام نذر کر دی — اور تمہیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی۔ اب تمہارے وجود کے کسی گوشہ میں ایک ایسا زخم پیدا ہو گیا جو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ تمہاری تکالیف، آہ و زاریاں، تمہارے روبرو ایستادہ رہیں گی۔ تم گویا اپنے سلسلۂ مصائب کو تحریک دیتے، اور جاری کرتے رہیں گے۔

ایسی نوبت پر، ماضی کو اپنے میں سے بالکل محو کر دینا ایک صحیح چارہ کار ہے — اپنے دلخراش تجربات کی یاد رد کر دو۔ دیگر دلچسپ و فرحت بخش مشاغل میں، بکمال انہماک و دلچسپی کے ساتھ ایسے مصروف ہو جاؤ کہ تمہیں اپنی تکلیف سے پریشان و حواس باختہ ہونے کا موقع نہ مل سکے۔

کہا جاتا ہے، مصیبت و غم ایک عظیم المرتبت معلم ہے۔ خود غرضی کے استیصال کے لئے اس سے مدد ملتی ہے۔ ہم جنسوں کے حالات کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے سے، ان کے واقعات کی قدر و قیمت سے انسان میں ہمدردی کے سدا جاری چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

اکثر لوگ جو ناکامیِ محبت کے رنج و الم سے کچلے اور روندے گئے تھے، بعد، مشاہدہ ہے، بلند کردار، ترقی یافتہ شخصیتوں اور وسیع عمیق فہم و شعور کے ساتھ ابھر آئے ہیں۔

شخصی تحلیل ہمیشہ پسندیدہ رہی ہے جب تمہاری ثابت قدمی میں لغزش آجائے، مایوسی کی انتہائی گہرائی میں تم نے اپنا مسکن بنا لیا ہو، تو اپنی نبرد آزما جبلتوں کو بیدار کرنے کی مخلصانہ سعی کرو۔ "اس سے کیا حاصل؟" کہکر شاید تم ہاتھ اٹھا لو، اور اسی مایوسی کے عالم میں اپنے کو گم کر دو، جو تمہیں نگل رہی ہے۔

صاحبِ فہم و فراست کا فرض ہے کہ ان خونخوار درندوں کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کی پہلی خواہش ہی سے فائدہ اٹھائے۔ کچھ نہ کچھ دلچسپ مشاغل کرو۔ ایسے اوقات میں جسمانی نقل و حرکت ایک حیرت انگیز علاج ہے۔ پیدل چلنا اور خوب چلنا، یہاں تک کہ تم تھک کر چور چور ہو جاؤ۔ حصولِ مقصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوا ہے۔

خواہ تم کسی امر پر عمل پیرا ہو جاؤ، لیکن اپنے عز و وقار کو قائم و مستحکم رکھو، خود کو شکست خوردہ ہرگز ہرگز نہ بناؤ۔ مزاحمتوں سے کشمکش کرتے ہوئے، جوں جوں تم آگے بڑھو گے، تمہاری طاقت، قوتِ ارادی اور مضبوط ہوتی چلی جائے گی۔

آخر کار، وہ قوت و سیرت جس کی نشو و نما تم میں ہو جائے گی، دنیا میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے تم میں زیادہ استطاعت پیدا کر دے گی۔

ہاں! اگر تم نے کسی سے محبت کی — اور ناکامی نصیب ہوئی، حیران و پریشان نہ ہوں۔ تقریباً ہر شخص کو اس قسم کے تجربہ میں گذرنا پڑتا ہی۔ یاد رکھو اپنے کو کامل طور سے سنبھال لینا، یہ تمہارے ہی قبضہ و قدرت میں ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک عملی تصور پسند، ایک تعمیری فلسفی بنجاؤ، اور اپنے تلخ تجربات سے اوروں کو فائدہ پہنچاؤ۔

مترجمہ بیس، بی انشا

سب رس اگست ۱۹۴۸ء

ہم سفر

تعطیلات ویسے بھی جلد گزرتے ہیں، جیسے پر لگ گئے ہوں۔ گاؤں پہنچ کر ہاتھ پاؤں بھی سیدھے نہ کرنے پایا تھا کہ آٹھ دن گزر گئے اور آنکھ جھپکانے ہی میں (مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوا) بیس۲۰ دن گزر گئے۔ دلچسپیوں کا یہ عالم تھا کہ بس اُمڈی پڑتی تھیں آج شکار پارٹی ہے تو کل جلسۂ موسیقی، کہیں دعوت ہے تو کہیں ڈرامہ، ہر وقت دوست احباب کے جھرمٹ میں گھرا رہتا۔ ہنسی دل لگی رہتی۔ ڈھول دھپا رہتا اور اسی طرح تعطیلات ختم ہونے کو آ گئے۔ واپسی کی ٹھہری۔ والدین کی جلدی نے دو چار دن ٹھہرنے کی بھی مہلت نہ دی سمجھتے ہوں گے کہ دو۲ چار دن پہلے چلا جاؤں گا تو واپسی میں شاید کچھ دن پہلے اجازت مل جائے۔ مجبوری تھی۔ سارے دوست احباب اسٹیشن پہنچانے اور خدا حافظ کہنے آئے تھے ان لوگوں کے جھرمٹ سے دور میری نظریں چند اور چیزوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہرے ہرے کھیت، گہری گہری باولیاں، گھنے جنگل، وحشی پرند سب مجھے حسرت سے تکتی دکھائی دیں میں نے سب پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا سوچا کہ اب چاہے گاڑی قیامت تک یہیں کھڑی رہے۔ میں تو اب جھانکنے والا نہیں ہوں۔ ڈبہ میں میرے اور ایک دو۲ مسافروں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اور میرے نزدیک دوسرے مسافروں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن گاڑی اب چھوٹنے کو ہوئی تھی کہ گاؤں والوں کا ایک قافلے کا قافلہ ڈبہ میں گھس پڑا۔ کسی کے ہاتھ میں ڈوئی ہے تو کسی کے ہاتھ میں چھاج۔ کوئی بچہ چمکار رہا ہے تو کوئی تمبا کو گھول رہا ہے۔ ایک عجیب سی ہو بونگ مچ گئی۔ مارے چیخوں کے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ "ارے وہ ٹوکرا کہاں ہے" "ارے بچے کو ادھر دے" میں تو بوکھلا گیا۔ ڈانٹ کر کہا "جاؤ۔ اے۔ جاؤ، دوسرے ڈبے میں" وہ کہنے لگے "دوسرے اسٹیشن پر ہی اتر جائیں گے صاب" مجھے بہت غصہ آیا لیکن چپ ہو رہا۔ "اسٹیشن کا تو سوال ہے" سمجھا اور ان میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک بے تکلف ہم سفر نے میرے بستر پر بیٹھنے کی "سعیٔ بلیغ" کی۔ بھرا تو بیٹھا ہی تھا۔ اپنے پاؤں پھیلا دئے۔ وہ کسمسا کر اٹھے۔ اور چپ چاپ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے ان کی اس "خاموشی" نے مرے دل پر بہت اثر کیا اور میں نے از راہِ عنایت اپنا بستر کھینچ لیا۔

سفر کئی طرح دلچسپ ہو سکتا ہے۔ یا تو کوئی "اچھا ہم سفر ہو" یا پھر کوئی دلچسپ ناول ہی اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر اس خاموش ہم سفر کی باتیں سنئے۔ راستہ بڑے مزے سے کٹ جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ناول "گہری چال" تھا۔ لیکن اپنے ہم سفروں کے بارے میں بڑا بد قسمت ثابت ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے بات چیت کرتا، دوسرے گھر سے بورڈنگ جاتے ہوئے کوئی بھی اس اقدام پر مائل نہیں ہوتا۔ گاڑی اپنی رفتار پر آ گئی تو میں نے اپنا ناول نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی تو کوئی شعر گنگنانے لگ جاتا چند اسٹیشن گزر گئے لیکن یہ بات باعث اطمینان تھی کہ برآمد کی بہ نسبت درآمد کم ہے۔ آگے کے اسٹیشن پر ایک صاحب صورت و لباس سے تعلیم یافتہ معلوم ہونے والے، ڈبے میں گھسنے کے لئے لپکے۔ میں نے صورت بنائی۔ مخلصانہ انداز میں کہا "جگہ نہیں ہے" "کھڑا رہوں گا"۔ جواب دیا گیا "جی" کہہ کر خون کے گھونٹ پیتا میں پھر سے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اب اِن نو وارد صاحب کی شرارت تو ملاحظہ کیجئے کہ کھڑے کھڑے ناول سے شوق فرما رہے ہیں۔ میں نے کنکھیوں سے ان کے اِس قابلِ گرفت فعل کو دیکھا اور انجان بن گیا تھوڑی دیر بعد جب میں ورق پلٹنے کو ہوا تو کہنے لگے "جی ذرا۔ معافی چاہتا ہوں۔ میں ایک دو۲ سطریں اور۔ شکریہ" میں نے کتاب بند کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ بھلا وہ شخص جس نے ہمارا کہنا نہ مانا

ڈبے میں در آیا اس کا کیا لحاظ۔ کچھ جھجکے۔ پھر کتاب ہاتھ میں لے لی اور اسے میرے صندوق پر رکھ دیا۔ وہ برابر دو اسٹیشن کھڑے رہے۔ کوئی بات کرنے والا نہ کوئی ہمدرد عجیب عالم بیکسی تھا کھڑے کھڑے پاؤں سُن ہوگئے تھے اور آخر کسی نہ کسی طرح سامنے کی سیٹ پر جگہ نکال ہی لی۔ میں ان کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا کھنکار کر مجھے متوجہ کرنا چاہا مگر میں انجان بنا رہا۔ نہایت ہی ملائم لہجہ میں دریافت کیا گیا "کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے"۔ میں نے سنی ان سنی کردی کچھ سٹ پٹائے، میرے گھٹنے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے آگے کے اسٹیشن پر پانی مل سکے گا"۔ میں نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آپ دق نہ کریں۔ میں کچھ پریشان سا ہوں" ان کے لئے یہ جاننا کہ میں پریشان ہوں گویا کھلا دعوت نامہ تھا نہایت ہی ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "آخر میں بھی تو سنوں! کیوں کوئی خاص بات تو نہیں"۔ "جی نہیں" میں نے ٹالتے ہوئے کہا مگر مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں پریشان سا ہوں اور اگر پہلے نہ بھی تھا تو اب ہوگیا ہوں۔ انھوں نے بڑھ کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگئے سارے ڈبے میں ہُو کا عالم تھا۔ تقریباً تمام مسافر ایک ایک کرکے اتر چکے تھے۔ خاموشی ناقابل برداشت ہو رہی تھی انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے کوٹ میں سے ایک کتاب نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک آہ کے ساتھ کتاب بند کردی مجھے بھی دل لگی سوجھی۔ میں نے انھیں مخاطب کیا۔ تنہا سفر میں یہ ہم سفر ہی کچھ غنیمت معلوم ہوا۔ "آپ بھی کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں" "کچھ نہ پوچھئے" انھوں نے کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے جواب دیا۔ "آخر کچھ تو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہنے لگے "جناب جس کا رنج اسی کو آپ کو بجائے ہمدردی کے ہنسی آئیگی"۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ سخت ہمدردی ظاہر کروں گا تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھا اور نظر چار ہوتے ہی مسکرا کر کہنے لگے۔ "میں بڑا بدنصیب ہوں۔ بچپن ہی سے محبت کے نام سے بھاگنے والا۔ دنیا کو دارالمحن سمجھتا جہاں انسان صرف رونے دھونے کے لئے آتا ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک رشتہ کی بہن سے ملاقات کے واقعات اور پھر پروفیسر صاحب کی بیوی سے محبت کا واقعہ اس درد انگیز اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ میں ہمہ تن گوش بن گیا "ہوں" "ہوں" کی آوازیں تیزی سے نکلنے لگیں۔ اور آخر میں میں نے ایک آہ کے ساتھ ہمدردانہ لہجہ میں کہا "آپ واقعی قابل رحم ہیں آپ کی زندگی میں عجیب عجیب واقعات رونما ہوئے۔ آپ ہی کا دل و جگر ہے جو سہہ گئے ورنہ مجھ جیسا ہوتا تو مر ہی جاتا"۔ اس کے بعد میں نے توشہ نکالا اور اصرار کے ساتھ انھیں بھی شریک کرلیا میری نظروں میں ان کی عزت کئی گونہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کا دل بہلانا میرا اولین فرض بن گیا۔ میں نے کئی غزلیں گا کر سنائیں دلچسپ موضوع چھیڑے، بہت کھل کر بات چیت کی پوری دلچسپی سے اُن کی باتیں سنیں۔ اپنے گزشتہ برتاؤ کی معافی چاہی، اُن کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ انھوں نے اپنا سامان درست کیا۔ اور جب گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی تو میرا سفری ناول بطور یادگار مانگا میں نے بخوشی پیش کردیا جس پر انھوں نے بھی اپنی کتاب "خواب خیال اور دیگر افسانے" مجھے تحفتہً دی کہ میں بقیہ فاصلہ اسے پڑھ کر کاٹوں۔ گاڑی چلنے لگی وہ اتر چکے تھے۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہا۔ بہت دور تک اُن کی مسکراتی ہوئی شکل آنکھوں میں پھر رہی

پہلا ہی افسانہ خواب و خیال جوں جوں پڑھتا جاتا تھا۔ حیرت بڑھتی جاتی تھی اور پھر غصہ بھی آنے لگا۔ دانت پیستے ہوئے میں نے کتاب بند کردی جی تو چاہتا تھا کہ کتاب کے پُرزے پُرزے اڑا دوں مگر ضبط کیا۔ "جھوٹا" "مکار" "دغاباز" "فریبی" "کتا" "گدھا" نہ جانے کیا کیا اس عیار ہم سفر کی شان میں کہہ گیا۔ اس کی داستان کا سارا پلاٹ اسی قصہ کا تھا بیہودے نے کتنا دھوکہ دیا! اسی پیچ و تاب میں بیٹھا تھا۔ اپنی سادہ لوحی پر خود کو کوستا اور اس ناہنجار کو بددعائیں دیتا رہا جس نے میری توجہ سے اس بری طرح فائدہ اٹھایا دور سے یونیورسٹی کی سر بفلک عمارت نظر آرہی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اور میں سارے واقعات کو بھول چکا تھا۔

رشید قریشی

میم صاحب کا پردہ

ہمارے مکان کے بازو میں ایک اور ہمارا مکان ہے جو کرایہ پر دیا جاتا ہے وہ مکان ایک ہندو صاحب نے ہم سے کرایہ پر لیا ان کی بی بی سوئیٹزرلینڈ کی رہنے والی تھیں' ان کے میاں یورپ سے آن کر سکندرآباد کے ہوٹل میں معہ اپنی بی بی کے ٹھیرے تھے جب ہمارا مکان ملا تو اس میں آکر اتر گئے بی بی کو ایک لفظ اردو کا نہیں آتا تھا انھوں نے ہم سے کہا میں حیدرآباد میں کسی کو نہیں جانتی آپ جب کہیں جائیں مجھے ہمراہ لیجئے' اور حیدرآباد کی بیبیوں سے ملائیے چنانچہ جب میں کہیں جاتی ان کو بلا لیتی وہ میرے ساتھ اکثر شادیوں میں کلب وغیرہ میں جایا کرتیں نہایت شریف کم سخن بی بی ہیں ایک روز میں نے یک بیک کہلا بھیجا کہ میں شادی میں جا رہی ہوں آپ بھی چلئے انھوں نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر پہلے کہلا بھیجاتیں تو میں آپ کے ہمراہ چلتی اس وقت میرے صاحب دفتر گئے ہیں ان سے میں نے اجازت نہیں لی' یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ایک یوروپین عورت کے ایسے اچھے خیالات ہیں۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی لیکن کبھی تنہا کسی کے پاس نہیں جاتی اپنے شوہر کے ہمراہ جایا کرتی ورنہ میرے ہمراہ یا اپنی کوئی دوست عورت کے ہمراہ۔ وہ سینما تھیٹر کا شوق نہیں رکھتی تھی ان کے کمرے میں بٹلر یا بائے وغیرہ بغیر اجازت نہیں آسکتا تھا ان کے شوہر کے دوست اگر آتے اور شوہر گھر پر نہ ہوتا تو وہ نہیں ملتی تھیں البتہ شوہر کی موجودگی میں وہ دوستوں سے ملتی تھیں' شوہر دفتر کو چلا جاتا خود گھر کا کام کیا کرتیں یا سلائی سیا کرتیں۔ ان کی زندگی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی یہ اسی بی بی کا ذکر ہے جس کی ساتھ پشت نے پردہ نہیں کیا۔ اس کا نام پردہ ہے' اصل پردہ آنکھ کا اور دل کا ہی اگر یہ ہے تو سب کچھ اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا

اندھا

سنتا ہے حسنِ شمس و قمر دیکھتا نہیں — یعنی نظامِ شام و سحر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی پیرہن پہ گناہوں کے داغ ہیں — دنیا کو جانتا ہے مگر دیکھتا نہیں
اُس کو بھی ہیں نصیب محبت کی لذتیں — دل تھامتا ہے تیرِ نظر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی دل میں آگ بھڑکتی ہے عشق کی — جلتا ہے اور رقصِ شرر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی سر نے پایا ہے احساسِ بندگی — سجدہ میں گر تو جاتا ہے در دیکھتا نہیں
اُس کو سنبھال لیتی ہیں ہر بار ٹھوکریں — چلتا ہے اور راہ گذر دیکھتا نہیں
باتوں سے تاڑ لیتا ہے باطن کی حالتیں — ملتا ہے اور روئے بشر دیکھتا نہیں
ہنستا ہے صرف اپنے لئے غیر پر نہیں — روتا ہے اور دامنِ تر دیکھتا نہیں
معلوم ہے تمول و غربت کی کشمکش — آنکھوں سے امتیازِ نظر دیکھتا نہیں
اس کو سکون چاہئے جینے کے واسطے — رہتا ہے اور اپنا ہی گھر دیکھتا نہیں

میکش

غزل

خود وہ جفا پر مائل ہیں، ارمان جفا کا کون کرے
اُن کے کرم کی حد نہیں کوئی اُن سے تقاضا کون کرے

جانِ تمنا تو ہے مگر اظہارِ تمنا کون کرے
تیری بدولت ہم ہوئے رسوا اب تجھے رسوا کون کرے

زیست عبارت ناکامی سے زیست کا حاصل ناکامی
غم کے سوا دنیا میں نہیں کچھ پھر غمِ دنیا کون کرے

تو ہی قاتل تو ہی مسیحا تو ہی مارے تو ہی جلائے
دردِ محبت کا میرے جز تیرے مداوا کون کرے

ضبط سے ہے ناموسِ محبت کون بنائے غم کو ڈھائے
دل سے جو موجِ خون اُٹھے اس موج کو دریا کون کرے

میری شکستہ کشتی کو ہر موج سہارا دیتی ہے
موجیں ہی جب ساحل ہوں ساحل کی تمنا کون کرے

دل کے ہیں سارے جلوے نمایاں کچھ نہ حقیقت کچھ نہ مجاز
دل اک رازِ سربستہ ہے رازِ دل افشا کون کرے

ہجر میں لب پر دم ہے مگر دے کون تجھے تکلیفِ خرام
تو اک محشر ہے سرتاپا محشر برپا کون کرے

تابشؔ میں رودادِ محبت دل کو سناتے ڈرتا ہوں
دل ہے مرا ہمراز کسی کا دل پہ بھروسا کون کرے

مسعود الحسن تابشؔ

غزل

جس کو دیکھا سو آپ کا دیکھا
جس کو پایا سو آپ کا پایا

تیری ہستی سے آشنا جو ہوا
ذرہ ذرہ کو آشنا پایا

زندگی کو وبالِ جاں سمجھا
موت کو صبر آزما پایا

اُن کی ہرجائی سے نقیؔ ہم نے
اُن کی یکتائی کا پتہ پایا

نقیؔ

چاند سلطانہ

تیرا دماغ واقفِ غیب و حضور تھا
دل نورِ حق سے غیرتِ صد کوہِ طور تھا

رُخ پر جلالِ عصمتِ مریم کا نور تھا
بازو میں زورِ بازوئے حیدر ضرور تھا

اکبر کے دل میں صورتِ گلشن ترے دم سے تھی
کشتِ دکن ہری ترے ابرِ کرم سے تھی

طوفان تھا، زلزلہ تھا، نہ تھا لشکرِ مغل
آواز طبلِ جنگ سے تھرا گئے جبل

تیغیں کھنچی ہوئیں، وہ عیاں برچھیوں کے پھل
وہ رن پڑا کہ خوف سے گھبرا گئی اجل

لیکن تری جبیں پہ شکن تک نہیں پڑی
مغلوں کے ہوش اڑ گئے تو اس طرح لڑی

دشمن یہ کہہ رہے تھے کہ رن اپنے ہات ہے
نقشہ وہ آ پڑا ہے کہ ہر چال مات ہے

کل صبح سارے رنج و محن سے نجات ہے!
واقف نہ تھے کہ رات قیامت کی رات ہے

ارماں دلِ عدو میں رہا قال و قیل کا
شب بھر میں تو نے بھر دیا رخنہ فصیل کا

مشکل کو تیرے عزم نے آسان کر دیا
فوجِ شہنشہی کو پریشان کر دیا!

ہمت نے سورماؤں کو حیران کر دیا
عزت پہ تو نے جان کو قربان کر دیا

احمد نگر کے دل پہ ترے غم کا داغ ہے
یہ داغ اس کی بزمِ عزا کا چراغ ہے

خدمت وطن کی تیری عبادت رہی مدام
ہے یادگارِ دہر ترا حسنِ انتظام

تیری بہادری میں کسی کو نہیں کلام
ملتے ترے چمن سے شکاری شکستہ دام

تھا غم سے حال زار دلِ دردمند کا
لیکن جھکا نہ سر ترے عزمِ بلند کا

غربت کی بے بسی تجھے اپنے وطن میں تھی
بیگانہ مثلِ سبزۂ بیکس چمن میں تھی

سوزاں بسانِ شمع بھری انجمن میں تھی
اک حور تھی کہ صحبتِ زاغ و زغن میں تھی

پایا نہ حیف گوہرِ عصمت نے جوہری
اجڑی ترے شباب کی کھیتی ہری بھری

گردن پہ بارِ عمرِ گریزاں نہیں لیا
دستِ عدو سے درد کا درماں نہیں لیا

ہمراہ رختِ حسرت و ارماں نہیں لیا
جنسِ بقا کو تو نے کچھ ارزاں نہیں لیا

سرشار ہو کے توڑ گئی جامِ زندگی
لوحِ جہاں پہ چھوڑ گئی نامِ زندگی

سکندر علی وجد

تیسرا درجہ

یہ ایک بہت ہی معمولی سا حساب ہے۔ دو ایک سے زیادہ ہے اور تین، ایک اور دو سب سے زیادہ۔ اس کے خلاف کہو تو حساب کا مبتدی بھی منہ پر تھپڑ لگائے گا۔ لیکن دفتری منطق نے اس بدیہہ کو نہایت دیدہ دلیری سے الٹ دیا ہے۔ اس کے ثبوت ہمارے اطراف بے شمار ہیں۔ دفتروں کے گریڈ ملاحظہ ہوں۔ امتحان کی کامیابی کے مدارج اور ریل کے درجے دیکھیے۔ اس عالم کا ہر "ایک" "دو" "تین" پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہ الٹا حساب نہ معلوم کس جادوگر نے سکھایا تھا کہ آج جدھر دیکھو اسی کا بول بالا ہے۔ ذہن اس قدر ماؤف ہو گئے ہیں! دفتروں میں ہر "پہلے گریڈ" والا نازاں ہے کہ وہ دوسرے گریڈ والے سے برتر ہے۔ اور دوسرے گریڈ والا تیسرے گریڈ والے غریب پر رعب گانٹھ رہا ہے۔ اسی طرح جو لڑکا امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہو، اس کی ہر جگہ عزت ہے۔ دوسرے درجے والے بھی یوں توں گزار لیتے ہیں۔ لیکن درجہ سوم کے کامیاب کے لئے عرصۂ آفاق تنگ نظر آتا ہے۔ دفتروں میں اس کے لئے جگہ نہیں، کاروبار میں یہ اعتبار کے قابل نہیں اور کالج سے نہیں تو وہ نکالا جاتا ہے۔ نہ معلوم خدا اس پر اتنا کیوں مہربان ہے کہ دنیا میں اس کے لئے جگہ رکھ چھوڑی ہے!

ایسے ہی تیسرے درجہ کو ادنیٰ کہنے والے، اسی منہ سے ذوق کے تیسرے درجہ کو اعلیٰ ترین درجہ کہنے سے نہیں جھجکتے۔ آخر اس بے ربطی کا کچھ ٹھکانا بھی ہے! اسی کی بدولت چلتی "گاڑی بن گئی" اور زنگی "نارنگی"۔

لیکن بہر حال ایک تشفی یہ ہے کہ یہ ساری جدتیں حال کی پیداوار ہیں۔ قدیم زمانے میں صرف گاڑی تھی، درجے نہ تھے۔ خواہ اسے درجہ اول قرار دیجئے یا درجہ سوم کہئے۔ یہی چیز ریل کی ایجاد تک بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس کے ثبوت اب تک بھی باقی ہیں۔ آپ کسی ریل گاڑی کو دیکھیں تو اس میں درجہ سوم ہی سب سے بڑا پائیں گے۔ اور اولین گاڑی جس پر آپ کی نظر پڑے گی اور آخری گاڑی جو آپ دیکھیں گے اور جو ہمیشہ آپ کے سامنے رہے گی، درجہ سوم ہی ہوگا۔ اور حقیقت میں ریل کے تمام ڈبوں میں یہی سب سے بڑا ہوتا ہے۔

اس بدیہہ کو الٹنے والا گروہ، دراصل دولت مندوں کا ہے جن کا بدقسمتی سے اس دنیا پر ہمیشہ اثر رہا۔ دولت مند دنیا میں ہوتے کتنے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جتنے وہ ہوں گے، اتنا ہی ان کا ڈبا اور ان کا درجہ ہوگا۔ اس درجہ کو خواہ وہ پہلا کہیں یا دوسرا۔ اس کے برخلاف درجہ سوم ایک جہان ہے۔ کیونکہ احتیاج اصل ہے اور ثروت اس کی ایک فروع۔

درجہ سوم نہ صرف ظاہر میں بڑا ہے، بلکہ اس کے باطنی اوصاف بھی بڑے اور گوناگوں ہیں۔ اس کی وسعت کو ساری دنیا کے دوسرے اور تیسرے درجے بھی، اکٹھے نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی زندگی، چہل پہل اور لطف کی ایک چھینٹ بھی پہلے اور دوسرے درجے کے بزرگوں پر نہیں پڑی۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں فطرت کے رنگا رنگ جلوے ہر آن بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس فضا میں آزادی کی پرورش ہوتی ہے۔ اور یہاں کی نشستیں خدا کی زمین کی طرح کسی کے لئے مخصوص، معین اور محفوظ نہیں ہو سکتیں۔

غالب کے گھر کی طرح اس عالم آب و گل کی رونق بھی ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ اور ہنگامہ تیسرے درجہ کی بلا شرکت غیرے، ملک ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کے پھونک کر قدم رکھنے والے اور ناپ تول کر کہنے والے نازنینوں کو اس ہنگامہ کی ہوا تک نہیں لگ سکتی۔ وہ بیچارے اسی پر نازاں رہیں کہ درجہ سوم کو اول بنا لیا ہے۔

ہنگامہ اصل میں، تیسرے درجہ کی جان ہے۔ اس کے بغیر یہ ایک عالم بے رونق ایک انجمن بے شمع، اور ایک خرمن بے برق ہے۔ اس ہنگامہ کی ابتدا ٹکٹ گھر سے ہوتی ہے۔ پلیٹ فارم پر یہ نشو ونما پاتا اور ریل میں تو فراٹے بھرنے لگتا ہے۔

جس چیز کی ابتدا ایسی اچھی اور جس کا اٹھان اس خوبی سے ہوا ہو اس کے انجام کا کیا پوچھنا۔ ہنگامہ کے اس عزم بوم میں جدھر دیکھیے ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔ گاڑی میں چڑھنے سے پہلے ہنگامہ، چڑھنے کے بعد ہنگامہ نشست پر ہنگامہ اس بات پر ہنگامہ اس بات پر ہنگامہ غرض بات بات پر ہنگامہ، اور ہنگامہ لازمۂ حیات ہے۔

حیات کے کیسے گوناگوں اور بوقلموں نقشے یہاں نظر کے سامنے ہیں۔ زندگی اور زندہ دلی رنج و مسرت اور محبت و نفرت کی نئی نئی تصویریں یہاں ہر روز دکھائی دیتی ہیں، ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی شاعر یا مصور کی بصیرت چاہیئے۔ ہر وضع قطع کے لوگ یہاں موجود ہوتے ہیں اور ان کی صورت شکل کی طرح، ان کے لباس اور خیالات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی کپڑوں کی گٹھڑی ہے تو کوئی "لنگوٹی آشنا"۔ ان میں کالے بھی ہیں، گورے بھی ہیں، سانولے سلونے بھی ہیں۔ اندھے بھی ہیں، گونگے بہرے اور کانے بھی ہیں، تنومند اور تحیم شحیم بھی ہیں۔ کسی کی ہاتھ بھر کی داڑھی ہے تو کوئی صفاچٹ، کوئی گولڈ فلیک سگریٹ کے کش اڑا رہا ہے تو کوئی پتوں کی بیڑی سے کام چلا رہا ہے۔

ان کے سامان کا تنوع بھی قابل دید ہے۔ کھانے کے لئے تانبے، پیتل، "ابونیم" "ام چینی" بانس کپڑے غرض ہر قسم کے توشہ دان یہاں موجود ہیں۔ ٹرنک چمڑے کے بھی ہیں، لوہے اور جست کے بھی ہیں اور انہیں کے پہلو بہ پہلو کپڑے کی گٹھڑیاں بھی ہیں۔ اسی طرح بستروں میں "اور آل" سے لے کر دری اور چادر کے بستر بند تک نظر آتے ہیں۔ کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو نہ بستر کے ممنون ہیں اور نہ توشے کے احسان مند۔ جہاں اسٹیشن آیا پیسے دو پیسے کے چنے پکوڑیاں لے کر پھانک لیتے ہیں اور جب سونے کا وقت آتا ہے تو ڈبے کے فرش یا کمبل کا بستر اور ہاتھ کا تکیہ ان کے لئے نرم نرم بچھونوں سے زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ بھی آسانی سے گزار لیتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں درجۂ اول اور دوم کے نشینوں کو دیکھیے۔ وہاں زندگی کا ایک اصول اور سفر کا ایک ہی ضابطہ کارفرما ہے۔ جو چیز زید کے پاس ہے وہی بکر، عمرو اور ایرے غیرے غرض ہر شخص کے پاس موجود ہے۔ وہی سوٹ کیس وہی ٹائی کیس اور وہی "ہولڈ آل" وہی "پلاس کے تین پات"، اور یہی ان کا سرمایۂ ناز ہے۔

زندگی کے ایک اور رخ پر نظر ڈالیے تو تیسرے درجے کے مناظر محض ہوش ربا ہیں۔ یہاں کی وسیع فضا میں، لوگ گروہ در گروہ، بیٹھے آپس میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی آلتی پالتی مارے بے تکلف بیٹھا ہے۔ کوئی نشست پر اپنے بازو ہی گٹھڑی رکھے اور اس پر سہارا دیئے لیٹا ہوا ہے۔ گفتگو دنیا کے ہر معاملے سے متعلق ہوتی ہے۔ گھر اور بیوی بچوں سے متعلق صحت اور بیماریوں سے متعلق، معاشی اور سیاسی امور سے متعلق، ادب اور فنون لطیفہ زمینوں اور آسمانوں سے متعلق، دنیا و مافیہا سے متعلق، لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان کی گفتگو کے اصطلاحی موضوع کیا ہیں۔ وہ فقط بولنا جانتے ہیں، اور ہم اصطلاحیں بنانا، ان کی معلومات کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "سکنڈ ہینڈ" بلکہ ان کے درجہ کی طرح "تھرڈ ہینڈ" ہوتی ہے، اور سچ پوچھو تو فرسٹ ہینڈ علم ذرا مشکل ہی ہے۔

باتوں باتوں میں کبھی تو تو میں میں بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حیات کے لئے ضروری بھی ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے کو دشمن سمجھتا ہے اور دوست سمجھتا ہے۔ جہاں کسی کے تیور کڑے دیکھیے یہ جانی دشمن ہے۔ دوستی کے راستے سے آؤ تو یہ جان فدا کرنے تیار ہیں۔ ان کی دوستی اور لڑائی ہر چیز پر خلوص ہے۔

چند خوش باش بھی تیسرے درجہ میں موجود ہوتے ہیں۔ جن کی زندگی قہقہوں اور نغموں سے معمور نظر آتی ہے۔ کچھ نصیب کے مارے بھی ہیں، جن کی صورتوں کو دیکھ کر محرم یاد آتا ہے۔

کہیں قلی سے پیسے دو پیسے پر ہنگامہ آرائی ہے۔ کہیں خوانچے والے سے مفت مال ہتیانے پر ہاتھا پائی ہے۔ ایک طرف سے بچوں کے رونے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، تو ایک جانب نظر بازیاں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ عموماً نوجوان ہوتے ہیں۔ جو گاڑی کے اسٹیشن پر رکتے ہی اپنے ڈبے سے اتر کر ٹہلنے یا سامان خریدنے کے بہانے زنانی گاڑیوں کے سامنے گھومنے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔

پہلے اور دوسرے درجے والے فطرت کی ان تمام تبدلوں اور رنگا رنگ کیفیتوں سے بے نصیب ہیں جو تیسرے درجہ والوں کو حاصل ہیں۔ وہ سردی کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور نہ گرمی ان میں تڑپ اور بے چینی پیدا کر سکتی ہے۔ سردیوں میں ان کے موٹے موٹے گدے اور دلائیاں اور بلانکٹیں انھیں مصنوعی طور پر گرم رکھتی ہیں اور گرمیوں میں پنکھے اور برف انھیں سردی پہنچاتے ہیں۔ پنکھے اور گدے ہی دراصل پہلے اور دوسرے درجہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کیا خوب وجہ امتیاز ہے؟۔ اس کو علیحدہ کر لیجئے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

تیسرے درجہ کے مسافر حقیقت میں فطرت کی آزاد روحیں ہوتی ہیں۔ جن سے کبھی نچلا بیٹھا نہیں جا سکتا۔ وہ کودتے پھاندتے چیختے چلاتے، ہنستے بولتے، گاتے روتے، سفر کی گھڑیوں کو لطف کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ درحالیکہ پہلے اور دوسرے درجے کے لوگ نہایت متانت کے ساتھ، سگریٹ پیتے اور اخبار پڑھتے، اخبار پڑھتے اور سگریٹ پیتے، نرم گدوں پر بھی پہلو بدل بدل کر یہ کٹھن لمحے کاٹتے ہیں۔

دنیا کی فلاح اور بہبود کو مطمح نظر بنا کر جتنے نظام آج معرض وجود میں آ رہے ہیں، سنتے ہیں کہ ان کا بڑا سہارا یہی تیسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ جب سب نقطۂ خیال نبٹ جائیں، تو زندہ رہنے کے لیے کچھ سہارا بھی تو ہو!۔ اس کا مقصد یہ کہ نصیب دشمناں تیسرے درجہ والوں کی حالت کچھ بری ہے۔ حالانکہ ان کی حالت بری تھی نہ اچھی ہوی۔ یہ جیسے تھے ویسے ہیں اور جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔ توجہ پہلے اور دوسرے درجے والوں کی طرف منعطف ہونی چاہئے۔ یہ درست ہوے تو دنیا درست ہوی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ سب انہیں پیٹ بھروں کی تصنیفات ہیں۔ یہ خود اٹھنا چاہتے ہیں اور تیسرے درجہ والوں کو سہارا بناتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ خود شہرت اور دولت کما لیتے ہیں۔ اور تیسرے درجہ والے جہاں تھے وہیں رہ جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو آج دنیا میں تیسرا ہی تیسرا درجہ ہوتا۔

عبدالقادر سروری

مشکل

حسن کے رعب سے ہے آنکھ اٹھانا مشکل
ضعف اتنا ہے کہ ہے جان سے جانا مشکل

بات بگڑی ہوی بن جاتی ہے آسانی سے
بگڑی تقدیر کا ہوتا ہے بنانا مشکل

حال کہہ سکتے ہیں، فریاد بھی کر سکتے ہیں
درد وہ چیز ہے جس کا ہے دکھانا مشکل

اُڑ گیا رنگِ عدو رزدِ حنا کی صورت
ان کی محفل میں ہوا رنگ جمانا مشکل

بارِ عصیاں سے جھکی جاتی ہے گردن میری
عرصۂ حشر میں ہے سر کا اٹھانا مشکل

روکنا حسرتِ دیدار کا آساں ہے صمیم
بعد دیدار کے ہے ہوش میں آنا مشکل

صمیم

غزل

اک تبسم کی جھلک دکھلا گیا
طور تک آیا مگر شرما گیا

پھر زمیں کا نہیں فلک تھرا گیا
پھر کسی کا دل کسی پر آ گیا

ہائے وہ ساقی کی مستانہ نظر
میں بھی سارے میکدہ پر چھا گیا

ہو گئی بدنام دنیا آپ کی
ہم مسافر ہیں ہمارا کیا گیا

اس ادائے شرم سے الٹی نقاب
طالب دیدار بھی شرما گیا

جیسے برحق تھا تغافل آپ کا
جو کوئی آیا ہمیں سمجھا گیا

مژدہ باد اے آبروئے عاشقی
آج اشکوں میں لہو بھی آ گیا

کوئی آساں تھا سمجھنا دیکھنا
درد دل دیکھا گیا سمجھا گیا

کس کے نغمہ نے متانت چھین لی
نجم پھر عہد جنوں یاد آ گیا

نجم افندی

یگانہ آرٹ

پرچھائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے
امکان ہو بس کی آواز [illegible] کیوں ہے
میں یہ نہیں کہتا کہ پلٹ آئے شباب
بھولا ہوا خواب یاد آتا کیوں ہے

(۲)

بیداری موہوم کا [illegible]
سونے کے لئے وقت بہت [illegible]
آنکھ کھلتے ہی آج تک [illegible]
[illegible]

مرزا یگانہ چنگیزی

ہنسی اور ظرافت

(بسلسلہ گذشتہ)

"ایک مثلث کے تین زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے مساوی ہوتا ہے" اس کو انگریزی زبان میں یوں ادا کر سکتے ہیں:-

The three angles of a triangle are together equal to two right angles

اور اگر اسی کا فارسی زبان میں ترجمہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ "مجموع زوایائے ثلاثہ یک مثلث مساوی دو زوایائے قائمہ باشد" اسی طرح عربی، ترکی، پشتو، ہندی غرض یہ کہ جس زبان میں چاہو ترجمہ کرلو۔ ہر لفظ اپنی اپنی جگہ اسی خوبی سے بیٹھ جائے گا جیسے انگوٹھی میں نگینہ پھر عبارت کی روانی کے ساتھ ساتھ مفہوم کے اصلی جوہر الگ چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر مذاق کی زبان میں ظریفانہ الفاظ و معنیین کے وقت واحد میں ذو ذو اشارے۔ بازاری اور معیاری زبان کا فرق۔ روزمرہ محاورے۔ ملکی رسم و رواج قومی روایات۔ تلمیحات۔ اشارات و ضمنیات یا دیو مالا کا ترجمہ اگر کسی اہل قلم نے کیا بھی تو ظرافت تو رہی ایک طرف اصل مضمون ہی خبط ہو جائے گا۔ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک حاشیے کا دُم چھلا الجھن کی رسی دراز کرتا رہے گا۔ مثلاً کسی ظریف نے کایستھوں کے مذاق کا خاکہ اڑایا ہے کہ:-

"برو من کہ فرستا بند کوچہ بود خندق نہ رفت"

یہ بالکل اسی قسم کا مذاق ہے جیسے کسی صاحب نے لفافہ پر تحریر فرمایا تھا کہ "در شہر دیوار زرد۔ بخدمت لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب برسد" یہاں دیوار زرد سے مطلب پیلی بھیت اور لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب سے مطلب "لالہ نک چھید لال صاحب" تھا۔ یا یہ جملہ کہ "بر دو گوش نشستہ بودم۔ ہر چند طلبیدم مگر حجام نیامد" یہاں دو گوش سے مطلب دوکان یعنی دوکان اور حجام سے نائی یعنی نہ آئی مراد ہے۔ اس طرح پورے جملے کے یہ معنی ہوئے کہ دکان پر بیٹھ کر اسے ہر چند بلایا مگر وہ نہ آئی۔ اسی طرح ایک شوقین طبع نے لفافہ پر بٹلر روڈ لکھنو کی بجائے سرک موسومہ بنام نائب السلطنت از ۱۹۱۷ء لغایت ۱۹۲۲ء شہر لکھنو لکھا تھا۔

کسی صاحب نے انگریزی میں بھی اسی قسم کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (There is no grass but god) یعنی سوائے خدا کے کسی کو چارہ نہیں ہے یہاں چارہ کا ترجمہ انگریزی میں (grass) کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ کسی پروفیسر نے تاریخ انگلستان کا ترجمہ کیا۔ جس میں ایک جملہ یہ تھا (The pope innocent issued a bull) صاحب موصوف نے اس جملے کا ترجمہ کیا کہ "معصوم پاپائے روم نے ایک سانڈ چھوڑا" بہرحال ان پُر مذاق جملوں میں سے کسی جملہ کا ترجمہ اگر کوئی صاحب کسی دوسری زبان میں کریں تو انھیں مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کرنا پڑیگا۔ مثلاً وہی جملہ لیجیے کہ "برو[1] من کہ فرستا بند کوچہ[2] بود خندق نہ رفت[3]" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جامن جو بھیجی گئی تھی گلی ہوئی کھائی نہ گئی مگر جن الفاظ سے یہ مذاق پیدا کیا گیا ہے ان کی شرح اس طرح کی جاوے۔

نوٹ نمبر (۱) - برومن برو "صیغہ امر" بمعنی جا من بمعنی من۔ یہاں من کے معنی واحد متکلم یعنی میں کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں من سے مطلب صرف "من" ہی ہے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر ایک اسم بنایا ہے یعنی "جامن"

جامن ہندوستان میں ایک پھل ہوتا ہے۔

نوٹ نمبر (۲) - کوچہ بمعنی گلی یہاں در اصل گلی کوچہ کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ گلی یعنی سڑی یا پھپوندی لگی ہوئی۔

نوٹ نمبر (۳)۔ خندق بمعنی کھائی مگر یہاں وہ کھائی مراد نہیں جو خندق کے معنوں میں مستعمل ہے بلکہ وہ کھائی مراد ہے جو فارسی میں خورد کے معنوں میں مستعمل ہے۔

نوٹ نمبر (۴)۔ رفت ماضی بعید بمعنی گیا یا گئی۔ مگر دراصل یہاں گئی جانے کے معنوں میں نہیں آیا ہے۔

غرض یہ کہ جو مذاق زبان سے متعلق ہو یا جس میں ضلع اور جگت وغیرہ کے چٹخارے ہوں کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرکے وہی چٹخارے پیدا کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ مثلاً یہاں ضلع سے مذاق پیدا کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے کسی طوائف سے پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ جواب پاک پھول۔ انھوں نے کہا کہ "تم تو شیرا ہو" طوائف نے جواب دیا کہ اگر آپ اس میں خوش ہیں تو ہم شیرہ (ہمشیرہ) ہی سہی۔

دو شخص چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک کانا تھا۔ انھوں نے چار کانے کا داؤ رکھا۔ پانسا پھینکا تو تین کانے پڑے۔ ایک ظریف نے پوچھا کہ "پریشان کیوں ہو" کہا کہ "پانچ روپیہ کی بازی ہے داؤ رکھا چار کانے۔ پانسا پھینکا تو پڑے تین کانے" وہ کہنے لگا کہ "حضرت تین کانے یہ ہیں چوتھے کانے آپ ہیں چاروں کانوں کو ملا کر رنگ کو تو اٹھ جاؤ۔ بدرنگ کے چگ کو پھر دیکھ لینا" یا جملہ میں کوئی غلط یا غیر موزوں لفظ بٹھا دیا ہو مثلاً

ایک میراثی کا لڑکا نماز پڑھتے وقت التحیات بھول گیا۔ نماز توڑ کر مولوی صاحب سے پوچھنے لگا کہ "خلیفہ جی بیٹھنے کا انترہ کیا ہے"

یا یہ واقعہ کہ:۔

چڑیا خانے میں ایک صاحب مع اپنے صاحبزادے کے جانوروں کے ملاحظے میں مصروف تھے۔ جس وقت وہ اس احاطہ کے سامنے پہنچے جہاں ہاتھی بند تھا لڑکے نے گنا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ان کے والد نے چلا کر کہا "دیکھنا بیٹا۔ بچ کے رہنا کہیں اس کا ڈنک نہ لگ جائے"۔

یا بعض اوقات مذاق پیدا کرنے کے لئے جملے کے الفاظ الٹ دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

ایک صاحب شترخانہ میں منشی کی جائداد پر نوکر ہوے۔ دوسرے روز کوئی افسر معائنے کو آیا۔ اور ان سے پوچھا تم کون ہو یہ فوراً گھبرا کر بولے میں منشی خانہ کا شتر ہوں۔

بعض اوقات لکھا ہوا کچھ ہوتا ہے مگر حرفوں پر نقطے وغیرہ نہ ہونے سے پڑھ کچھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک نسخہ میں لکھا تھا۔

"شربت بنفشہ وانہ الالچی۔ کسی صاحب نے اسے پڑھا۔ "شربت بنفسہٖ وانہٗ الالچی"

غرض یہ کہ ان سب کے لطف صرف ایک اہل زبان ہی لے سکتا ہے۔ ترجمہ کیا اور مزہ کرکرا ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ لفظی مذاق کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے جس میں لطف زبان اور حسن بیان کے جلوے نظر آتے ہیں اور دور سے کھڑے رہ کر دیکھو تو سب کچھ ہے اور نزدیک آکر ٹٹولو تو کچھ بھی نہیں۔

ہاں اگر ظرافت لفظی الٹ پھیر یا کسی خاص گروہ کے لب ولہجہ یا طرز تکلم کی نقالی کو چھوڑ کر حیات نگاری اور سیرت نگاری کے میدان میں قدم رکھے انسانوں کی متضاد کیفیتیں اور واقعات میں تناقض کی صورت پیدا کرے، مختلف قوموں کے عادات و اطوار اور ان کی خصوصیات اخلاقی رنگ میں پیش کرے تو اس میں ادبی خصوصیت اور معیاری ظرافت کا اصلی رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے گا ظریفانہ اور مضحکہ خیز افعال کون سے ہیں۔ ایک شیخی باز نواب جو زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہو ایک پروفیسر جو ہمیشہ اپنے خیالات میں غرق رہے یہاں تک کہ اگالدان کو گلاس سمجھ کر اپنے منہ سے لگائے۔

نہماک میں اپنا گھر سمجھ کر دوسرے کے گھر میں گھس جائے۔ اور لوگ کچھ پوچھیں اور وہ اپنے انہماک میں جواب کچھ کا کچھ دئے جائے شلاً۔
ایک لڑکے کا جوتا چوری گیا۔ اُس نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب ایک گھنٹے سے "کفش" ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہا ہے۔
مولوی صاحب جو مطالعے میں غرق تھے۔ سر جھکائے ہوئے فرمانے لگے "بیٹا غیاث اللغات میں کاف کے باب میں ڈھونڈو مل جائے گا۔
اسی طرح ایک کنجوس امیر ایک حریص مفلس بنے ہوئے مرشد، شریر طالب علم بے وقوف عالم، مارواڑی، افیونی، افغانی، غرض یہ کہ جدھر نظر اٹھاؤ گے ایک پرلطف مجمع نظر آئے گا۔ اور اُن کی باتیں سنو گے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ گے۔
"مشتے نمونہ از خروارے" چند مثالیں قابل ملاحظہ ہیں۔

ایک افیونی نے تقریباً ڈیڑھ سیر گوشت لاکر اپنی بیوی کو دیا۔ اتفاقاً وہ گھر میں سے غائب ہو گیا بیوی نے بلی پر شبہہ ظاہر کیا کہ شاید یہ کھا گئی ہو گی۔ افیونی نے کہا کہ بھلا اتنی سی بلی۔ اتنا گوشت کیسے کھا گئی۔ اچھا بلی کو تول کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا۔ بلی کو تولا تو اس کا وزن کل ڈیڑھ سیر نکلا افیونی نے تعجب سے کہا کہ گوشت تو مل گیا۔ لیکن بلی کہاں گئی۔

ایک بونا تھانے میں دوڑتا ہوا بدحواس آیا اور کہا کہ مجھے پناہ دو۔ تھانہ دار نے پوچھا کہ "واقعہ کیا ہے" بونے نے جواب دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو دست پناہ کھینچ کر مارا ہے "تھانہ دار نے پھر پوچھا کہ کیا وہ مر گئی" تو بونے نے جواب دیا کہ مری ہوئی تو نہیں مگر وہ مجھے پکڑنے آ رہی ہے۔

استاد نے جماعت میں ایک سوال کیا جو بچوں کی استعداد سے باہر تھا۔ یہ سن کر ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے کے کان میں کہا کہ ہمارا استاد بھی ذرا اُلّو ہی ہے۔ استاد نے انھیں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھ کر سمجھا کہ شاید جواب کی فکر میں ہیں خوش ہو کر کہا کہ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں زور سے کہو شاید درست ہو۔

موہن گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ اے ایشور روم کو ترکی کا دارالسلطنت بنا دے! باپ نے پوچھا کہ "موہن تم یہ دعا کیوں مانگ رہے ہو" موہن نے جواب دیا۔ اس لئے کہ امتحان کے پرچہ میں میں نے غلطی سے روم کو ترکی کا دارالسلطنت لکھ دیا ہے۔

ایک وکیل نے دوسرے وکیل سے کہا کہ تم گدھے ہو۔ دوسرے نے کہا کہ تم اُلّو ہو۔ دونوں نے جج سے شکایت کی جج نے کہا کہ آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جائیے۔ جب آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے پہچان لیں تو پھر آکر بحث کریں۔

ایک شخص کا کتا کھو گیا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جو اسے ڈھونڈ لائے گا اس کو دس روپے انعام دیا جائے گا۔ اشتہار چھپا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے دفتر پہنچے اور کہنے لگے کہ میں اشتہار کے منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ پھر کہا کہ اُن کے نائب سے مل سکتا ہوں۔ تو جواب ملا کہ وہ بھی نہیں ہیں۔ "اچھا تو ایڈیٹر صاحب ہیں" جواب دیا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں "پھر پوچھا کہ" سب ایڈیٹر صاحب تو ہوں گے۔ ان سے ہی مل لوں" جوان نے کہا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں" تو یہ فرمانے لگے کہ او ہو سب کے سب کتے کی تلاش میں مصروف ہیں۔ شکریہ۔ شکریہ۔

(باقی آئندہ)

مرزا عصمت اللہ بیگ

بھاکھا کے مسلمان شعراء

اس مختصر سے مضمون میں تقریباً سوا سو مسلمان شعراء کا کلام بقید تاریخ درج کرنا ممکن ہے۔ جنہوں نے زبان بھاکھا کو اپنا بنا لیا تھا۔ صرف بڑے بڑے چند افراد کا ذکر بہ تفصیل درج کر دیا جاتا ہے۔ اور کسی دوسرے موقع پر کسی دوسری محفل میں باقی شعراء جن کے یہاں پر صرف نام گنانے پر اکتفا کیا جاتا ہے مع نمونۂ کلام پیش کئے جائیں گے۔

پہلا مسلمان شاعر جس کا ذکر ملتا ہے۔ قطب علی تھا جو بارھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ مگر اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا۔

امیر خسرو کی پہیلیاں اور کہ مکرنیاں مشہور ہیں ہر خاص وعام کی زبان پر ان کی پہیلیاں اب تک ہیں یہاں صرف ایک نمونہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہاتھ جڑھا وہ گھر گھر ڈولے، بن مارے وہ روتا ہے   خسرو کہین بناؤ پہیلی، بن دادے کا پوتا ہے

خسرو کے بعد مدت تک کسی مسلمان ہندی شاعر کا پتہ نہیں ملتا۔ لودھی خاندان کے دور حکومت میں کبیر صاحب پیدا ہوتے ہیں اگر سچ پوچھا جائے تو خسرو، کبیرا در رحیم۔ یہی تین شعراء ہیں جن کا نام زبان ہندی سے محو نہیں ہو سکتا۔ کبیر صاحب کے بچن زبان زد خاص و عام ہیں۔ اور کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ایک نمونہ ان کے مقدس کلام سے درج کیا جاتا ہے۔

دیا کون پر کیجئے، کا پر نردئی ہوئے   سائیں کے سب جیو ہیں کیری کنجر دوئے

دیا۔ رحم، نردئی۔ بے رحم، کیری۔ چیونٹی، کنجر۔ ہاتھی، دوئے۔ دونوں، فرماتے ہیں کہ کس سے رحم کیا جائے اور کس پر ظلم جائز رکھا جائے۔ چیونٹی اور ہاتھی دونوں اسی رحمٰن و رحیم کی مخلوق ہیں۔

خاندان سوری کے مختصر سے دور میں دو شاعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک شیخ قطبن دوسرے ملک محمد مصنف پدماوت جس طرح سروانٹیز کے باعث ڈلسنیا ڈل ٹوباسو (Dulcinia - del Toboso) مشہور ہوئی اسی طرح ملک محمد نے سنگل دیپ کی پدمنی کو حسن و عشق کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اس کی داستان غم ہم پھر کسی وقت پیش کریں گے۔

دور مغلیہ میں جب کہ ہر طرف امن و اماں قائم ہو گیا۔ تجارت کے ساتھ دولت کی فراوانی ہوئی اور عوام آسودہ اور خوشحال ہوئے تو پھر ادب کا بھاگ جاگا۔ ہندی کے تمام مشہور شعراء اس دور میں گذرے ہیں۔ تلسی اور سور یا بہاری یا درید تو، متی رام اور بھوکھن یہ وہ شعرا ہیں جو کسی زبان کے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔

یہ سب دور مغلیہ ہی میں گذرے ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دکن کی سرزمین سے اس نئی زبان کی ابتداء ہوتی ہے۔ جسے پہلے ریختہ اور اب اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر خود ہندی میں کلام کرتے تھے۔ بیربل کے مر جانے پر اکبر کو بڑا صدمہ ہوا اور اس کے احساسات نظم ہو گئے۔

دین دیکھ سب دین، ایک نہ دینو دسہ دکھ   سو اب ہم کو دین، کچھ نہیں راکھو بیربل

دین = قابلِ رحم، دکھی = رنجیدہ، دین = دے ڈالا، دینوں = دیا، دکھ = دُکھ = ناقابلِ برداشت غم، راکھو = رکھا،
کہتے ہیں کہ غربا اور مساکین کو اس نے سب ہی کچھ دے ڈالا تھا۔ صرف ایک ناقابلِ برداشت غم تھا جو اب ہم کو دیا ہے
بیربل نے اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھا۔

اس خاندان میں شہزادہ دانیال اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی ہندی میں کلام چھوڑا ہے۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ نے
ہندی نظم کو سنوارا اور اپنی تصنیف نورس یادگار چھوڑی۔

دربارِ اکبری کے نورتن میں سے ایک عبدالرحیم خانخاناں تھے۔ فارسی اور بھاکھا کے صدہا اہلِ قلم ان کی سخاوت سے مستفیض ہوئے۔ خود بھی
نہایت پاکیزہ نظم لکھتے تھے۔ یہاں چند دوہے بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

اب رحیم مشکل پڑی، گاڑھے دوؤ کام سانچے تے تو جگ نہیں، جھوٹے ملے نہ رام

رحیم اس زمانے میں بڑی مشکل ہے۔ دونوں طرح مشکل ہے۔ سچ کہو تو دنیا داری نہیں نبھتی اور اگر جھوٹ کی راہ اختیار کی جائے تو
عاقبت خراب ہوتی ہے۔

کملا تھِر نہ رحیم کہے، یہ جانت سب کوئے پُرش پُراتن کی بدھو، کیوں نہ چنچلا ہوئے

کملا = دولت کی دیوی، پُرش پراتن = بوڑھا آدمی، وشنو کو بھی دیومالا میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بدھو = زوجہ، عورت،
چنچل = چلبلی، تھِر = مستقل، پابند، جو چنچل نہ ہو، یہ سب کوئی جانتا ہے کہ دولت کسی کے یہاں مستقل طور پر نہیں رہتی۔ آخر پُرش پراتن
کی زوجہ ہے کیوں نہ چنچل ہو۔

دیومالا میں کملا وشنو بھگوان کی زوجہ کہی جاتی ہے جن کا نام پُرش پراتن بتاکر رحیم کیا عمدہ چٹکی لیتا ہے۔

سب ہی سانتھی سَبل کے، نِبل نہ کوئی سہائے پون جرایت آنل کو، پاپک دیت بجھائے

سَبل = مضبوط، قوی، نِبل = کمزور، سہائے = حامی، مددگار، پون = آندھی، تیز و تند ہوا، انل = آگ، پاپک = چراغ، دیا۔
قوی کا ہر ایک ساتھ دیتا ہے مگر کمزور کا کوئی حامی نہیں۔ ہوا کو دیکھو کہ آگ کو تو روشن کرتی ہے اور کمزور دیا کو بجھا دیتی ہے۔

دُھور دھرت نج شیش پر، کہو رحیم کسی کاج جے ہی رج رشی پتنی، تَری، سو ڈھونڈت گج راج

دھور = مٹی خاک، نج = اپنے، شیش = سر، کاج = غرض، کام، جے ہی = جس، رج = دھور، خاک، رشی پتنی = گوتم کی ناری، اہلیہ، گج راج = ہاتھی۔
رحیم کہو ہاتھی اپنے سر پر خاک کیوں ڈالتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مٹی کی تلاش میں ہے جس کے چھونے سے اہلیا تر گئی۔
کہتے ہیں کہ اہلیا گوتم کی زوجہ تھی اور پتھر ہو گئی تھی جب بھگوان رام چندر جی اس راہ سے گذرے تو ان کی خاک پا سے اہلیا پھر
آدمی ہو گئی۔ ہاتھی آج تک اسی مقدس خاک کو تلاش کر رہا ہے جس سے اس کی زندگی بھی سنبھل جائے۔

اسی دور کے ایک اور شاعر قادر بخش گذرے ہیں جو زمانے کی ناقدر شناسی کے باعث یوں شاکی ہیں۔

گُن کی نہ پوچھے کوؤ اوگن کی بات پوچھیں کہا بھیو دئی کلجگ یوں کھرانو ہے
پوتھی اور پران گیان ٹھٹھن میں ڈار دیت چگل چبائن کو مان ٹھہرانو ہے
کادر کہت یا تے کچھو کہبے کی ناہیں جگت کی ریت دیکھ چپ من جانو ہے

کمول دیکھو ہو سب بھانتین سوی بہانت بہانت　　　گن نا ہر انون گن کا ہک پرانو ہے

گن ـ بھلائی، کمال، اوگن ـ برائی، دئی ـ یا الٰہی، کلجگ ـ موجودہ زمانہ، زمانہ کی تقسیم ست جگ، ترتیا، دواپر اور کلجگ چار حصوں میں کی گئی ہے۔ پوتھی ـ کتاب، گیان ـ علم، عقل ـ نداق، چگل ـ چغلی ـ چبائو ـ بہتان، مان ـ عزت، ہیو ـ دل، ضمیر، پرانون ـ کم ہوا، کم ہوا تصنیف میں آیا۔

بھلائی کی بات تو کسی کو آتی نہیں۔ جسے دیکھو برائی کی باتیں بناتا ہے۔ الٰہی آخر اس زمانہ کو کیا ہو گیا ہے۔ علم و فن کا طرف مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہر ایک چغلی اور بہتان میں مشغول ہے۔ قادر کہتا ہے کہ اس سے تو کچھ بھی نہ کہہ۔ دنیا کی ریت دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بہت بہتر ہے۔ میں نے خوب اچھی طرح غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کمال کی کمی نہیں ہے کمی ہے اس کے قدردانوں کی۔

برج بھاشا کی نظم کا ایک مجموعہ برج مادھوری سار کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کی رائے ہے کہ رسکھان نہایت شستہ بولی میں کرشن جی کی تعریف میں کتا کرتا ہے۔

ڈرے سدا، چاہے نہ کچھ سہے سبے جو ہوئے　　　رہے ایک رس چاہکے پریم بکھانول سو سئے

پریم وہ ہے جو ہمیشہ ڈرتا رہے اور کسی امر کی خواہش نہ رکھے۔ جو کچھ گذرے اسے سہتا رہے صرف یار کے خیال میں مست رہے۔ بس یہی عشق ہے۔

ستیہ نارائن حال ہی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ انھیں موسیقی سے خاص ذوق تھا ایک موقع پر غایت درجہ موسیقی کے ساتھ انھوں نے رسکھان کے حسب ذیل کلام کو پڑھا تھا۔

یا لکوٹی اور کامریا پر راج تہوں پر کو تج ڈاروں　　　اٹھوں سدھ نو ندھ کو سکھ نند کی گائے چرائے بساروں

آنکھیں سون رسکھان کبے برج کے بن باگ تڑاگ نہاروں　　　کوٹن ہوں کل دھوت کے دھام کریل کے کنجن اوپر واروں

لکوٹی ـ چھوٹی چھڑی، کامریا ـ کلیم، کمبل، تہوں پر ـ تین لوگ جن میں ساری ارض کو تقسیم کیا گیا ہے، تج ڈاروں ـ ترک کردوں، سدھ ـ عظمت، وکمال، ثروت نوندھ ـ دولت، بساروں ـ بھول جاؤں، کبے ـ کب، باگ تڑاگ ـ باغ اور تالاب، نہاروں ـ دیکھوں، کوٹن ـ کروڑوں، کل دھوت ـ سونا، طلا، دھام ـ مقام، کریل ـ کانٹے دار ایک قسم کا درخت، کنج ـ گنج، درختوں کا جھرمٹ میں تو بھگوان کرشن کی اس چھڑی اور کملی پر تینوں عالم ترک کردوں۔ اور آٹھوں سدھ اور نو ندھ کی لذت نند کی گائیں چرانے میں بھول جاؤں کاش میں اپنی آنکھوں سے برج کے جنگل، باغ اور تالاب دیکھ سکوں (شاعر نابینا تھا) میں اس خوبصورت کنج پر کروڑوں سونے سے بنے ہوئے مقام نثار کردوں۔

مانس ہو تو وہی رسکھان بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن　　　جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو منجھارن

پاہن ہوں تو وہی گر کو جو دھرو کر چھتر پرندر دھارن　　　جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں وہی کالندی کول کدنب کی ڈارن

مانس ـ انسان، بسوں ـ آباد ہوتی رہوں، پشو ـ جانور، حیوان، دھین ـ گائے، پاہن ـ پتھر، گر ـ پہاڑ، پرندر ـ کرشن بھگوان، کھگ ـ پرند، کول ـ کنارے۔

اگر میں آدمی بنایا جاؤں تو برج اور گوکل کے گوالا کے ساتھ جاکر رہوں، اگر میری قسمت میں جانور ہونا ہے تو پھر ہر روز نند کی

سب بس الست سننہ
گائیوں کے ساتھ چرا کروں۔ اگر میں پتھر بنوں تو اس پہاڑ کا جسے کرشن بھگوان نے چھتری کی طرح اپنے ہاتھ پر اٹھا لیا تھا۔ اور اگر پرند ہونا میری قسمت میں لکھا ہو تو پھر کالندی کے کنارے کدنب کی ڈالیوں میں میرا آشیانہ ہو۔

خال کی تعریف اردو شعرا نے خوب کی ہے۔ سید مبارک علی بلگرامی اپنے کلام میں اسے ایک اچھوتے رنگ میں پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

سب جگ پیرت تلن، تھکیو چیتہ یہ ہیر
تو کپول کو ایک تل، سب جگ ڈاریو پیر

پیرہ پیرنا، تیل نکالنا، تکلیف دینا، تل۔ اجناس کی قسم سے ایک اور خال کو بھی کہتے ہیں، تو۔ تمھارے، کپول۔ چہرہ، رخسار، دنیا جہاں تل کو (تیل کے لئے) پیرتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ وہی تل جب تیرے رخسار پر آگیا تو اس نے سارے جہان کو پیر دیا ہے۔

دور مغلیہ میں چھوٹے بڑے بہت سے مسلمان شعرا نے ہندی میں کلام کہا۔ اکثر کا تو صرف نام اور تخلص ہی باقی ہے۔ شیخ عثمان، جمال، طاہر، دلدار، شیخ وزیر، وغیرہم بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

بہادر شاہ کے ایک حاشیہ نشین عبدالرحمن نامی گذرے ہیں۔ انھوں نے (۱۰۷) دوہے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ایک یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پلکن میں راکھو پیہی، پلک نہ جہارڑ و سا سنگ
پتری سوتے ہو ہنی چین، ڈر پیت اپنے انگ

میں اپنے معشوق کی تصویر اپنی آنکھوں میں رکھتی ہوں۔ لحظہ بھر کے لئے جدا نہیں ہونے دیتی، پھر بھی ڈر یہ ہے کہ کہیں آنکھ کی پتلی بھی میری رقیب نہ بن جائے۔

سید نظام الدین بلگرامی اپنا تخلص مدھنائک کرتے تھے۔ غلام علی آزاد اُن کی بابت فرماتے ہیں:۔

سید نظام الدین شہرۂ روزگار و در موسیقی ہندی یگانہ ادوار است۔ در عصر خود ممتاز و بکرم می زیست و صفت مروت و سخاوت بمرتبہ کمال داشت و ہموارہ خلق خاص و عام را رنگی تازہ می بخشد و در صحبت نکتہ سنجی و لطیفہ گوئی میر مجلس بہ او مسلم می شد۔

مدھنائک بلگرام سے بنارس بغرض تحصیل علم روانہ ہوئے دو تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اوّل ناو چندریکا، دوم مدھنائک سنگار۔ ایک مرتبہ ان بزرگ نے میگھ راگ گا کر خوب بارش کی ۱۱۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

کاری کجراری انیاری جگ موہن کوں تن نچ ناری تی ترل ترین ہیں
جیسی میں ساوک جاوک جل پھرین پھر کیت سو کیسے ہوں رہت نہ گھیری ہیں
لال مدھنائک سو پیرول موہنی کول پٹ بیٹھری پنجر پرٹ نہ ہیری ہیں
سالوکی سدھار سو بجاہار ہکار ایسی ہیں کی کھلوناں کدھوں نہیں جات تیری ہیں

کجراری۔ کاجل لگائے، انیاری۔ نوکدار، ترل چنچل، تریری۔ آنکھ کا گھوینا، ساوک۔ کسی جانور کے چھوٹے بچے کو ساوک کہتے ہیں، ہیری ڈھونڈ ہیں۔

تیری کالی کاجل دار نوکیلی آنکھیں دنیا کو ہنستے ہوئے ایسی پھرتی ہیں جیسے کہ مچھلی کے بچے پانی میں پھرتے ہیں اور کسی کے روکے نہیں رک سکتے۔ مدھنائک کا دل اس جال سے بچائے پھر بھی نہیں بچتا۔ ان آنکھوں کی خوبصورتی تو دیکھو کہ یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہیں یا تیری پیاری پیاری آنکھیں ہیں۔

سید رحمت اللہ نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی ایک دوہا جو آنکھوں کی تعریف میں انھوں نے لکھا بہت ہی اچھا ہے۔

آن بان کو لہت ہیں نینن بان سمان
وے لاگت سالت جو یہ دیکھت بیدھت پران

عوام آنکھوں کی بان (تیروں) سے مشابہت بتاتے ہیں مگر بان تو لگنے سے زخم پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے تو دیکھنے سے ہی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

ان کے ہمسر میر عبدالجلیل گذرے ہیں جنھوں نے اپنی سیت [illegible]
نقشہ کھینچا ہے۔

پھلواری گھونگھٹ کی یا تین جات   سمن باس بن چھائیں نہیں سُہات

کہتے ہیں پھولوں کی خوشبو بھی جب تک چھن کر آئے پسند خاطر نہیں ہے۔ اس لئے تو گھونگھٹ کا استعمال جائز رکھا گیا ہے۔

زبان کی شستگی، سلاست اور موسیقی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برج بھاشا میں رس کھان، رس لین کا درجہ بہت اعلیٰ قرار دیا جائیگا۔

رس لین کا پورا نام سید غلام نبی تھا۔ میر عبدالجلیل کے ہمشیرزادے اور بلگرام کے رہنے والے تھے ۱۷۳۷ء میں رنگ درپن اور ۱۷۴۱ء میں رس پربودھ ختم کی۔ چند نمونے ان کے کلام سے پیش کئے جاتے ہیں۔

اے من ریت بچتر ہے ریت نینن کی جیت   بکھ کا جر سج کھائے کے جیہ اورن کی لیت

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے دل ان کی آنکھوں کا عجیب طرز تو دیکھ خود تو زہر یلا کاجر کھاتی ہیں اور دوسروں کے دل پر آفت ڈھاتی ہیں۔ ایک جگہ آنکھ کے کھلنے اور بند ہونے کی تشریح کرتے ہیں کہ بند ہوتا تو ان کی ریت ہے مگر کھلتے وقت پریم کا اثر ہوتا ہے۔

کھلت پریم کے جور تے ، مندت نیم کی جور

ہم کہہ چکے ہیں کہ سوا سو مسلمان شعرا کا تذکرہ جنھوں نے بھاکھا میں نظم لکھی ہے۔ ایک مضمون میں لانا ناممکنات سے ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹا سا مضمون اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ آئندہ اس جانب کسی کی توجہ مبذول ہو اور یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی جائے کہ دکن کے اہل قلم نے کہاں تک اس ترقی میں حصہ لیا۔ بیجا پور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے علاوہ اب تک صرف ایک نام ہاشم بیجا پوری کا ملتا ہے۔ ابنائے وطن کا فرض ہے کہ اپنے بزرگوں کا نام دنیا میں جیتا جاگتا رکھنے کے لئے انھیں دنیا سے روشناس کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

میں اب اس مضمون کو سید برکت اللہ کے دو تین نمونے درج کرکے ختم کرتا ہوں۔

تم و مک ہم پتنگ اجگت کیسے سنائے   } من شمع جاں گدازم
بن دیکھے نہیں رہ سکوں دیکھے رہوں نہ جائے   } سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

پیمی بند و ترک ہیں ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت میں دیپ ایک ہیں بھائے

ہوں چکئی و اسندھ کی جہاں نہ سورج چند
رات دیس نہیں ہوت ہے نادکھ نہیں آنند

بھاکا کے مسلمان شاعروں کی فہرست

(الف)

۱ اکبر
۲ ابراہیم عادل شاہ
۳ ابراہیم
۴ انور خاں
۵ احمد
۶ آصف خاں
۷ اعظم خاں
۸ میر احمد بلگرامی
۹ اعظم
۱۰ سید امیر علی
۱۱ الہ داد
۱۲ انشاء
۱۳ اکرم

(ب)

۱۴ بارک
۱۵ پیتم
۱۶ پریمی
۱۷ بختاور خاں
۱۸ سید برکت اللہ بلگرامی

(ج)

۱۹ جمال الدین
۲۰ جمال

(د)

۲۱ شہزادہ دانیال
۲۲ شہزادہ دارا شکوہ
۲۳ دلدار
۲۴ دانشمند خاں
۲۵ دین

(ھ)

۲۶ ہمت بہادر
۲۷ ہاشم بیجاپوری
۲۸ ہمت خاں

(و)

۲۹ شیخ وزیر
۳۰ وہاب
۳۱ واجد
۳۲ واحد

(ز)

۳۳ زین الدین

(حطی)

۳۴ خان
۳۵ خسرو
۳۶ حسین
۳۷ حاجی
۳۸ طاہر
۳۹ طالب شاہ
۴۰ طالب علی بلگرامی
۴۱ یعقوب خاں
۴۲ یوسف خاں
۴۳ یزدانی
۴۴ حسن مارہروی
۴۵ حسین

(ک)

۴۶ کبیر
۴۷ کریم
۴۸ کشور علی
۴۹ کاظم علی

(ل)

۵۰ لطیف

(م)

۵۱ مبارک
۵۲ ملک محمد جائسی
۵۳ محبوب
۵۴ میر رستم
۵۵ محمد
۵۶ مدہنالک
۵۷ مظہر جان جاناں
۵۸ میاں
۵۹ میرن
۶۰ مہیر
۶۱ مراد
۶۲ شاہ محمد

(ن)

۶۳ نور محمد
۶۴ نواز بلگرامی
۶۵ نیمی
۶۶ غلام نبی
۶۷ نیاز
۶۸ نشاط
۶۹ مرزا روشن نظیر
۷۰ نجیب خاں

(س)

۷۱ سلطان
۷۲ سید پہاڑ

(ع)

۷۳ عالم
۷۴ عبدالرحیم خان خاناں
۷۵ عثمان
۷۶ عبدالرحمن
۷۷ عبدالجلیل بلگرامی
۷۸ عادل
۷۹ علیم
۸۰ علی
۸۱ محمد عارف بلگرامی
۸۲ خان عالم
۸۳ خان ملتان
۸۴ خان سلطان
۸۵ عبدالواحد ذوقی بلگرامی

(ف)

۸۶ فضائل خاں
۸۷ فرید

(ص)

۸۸ صاحب

(ق)

۸۹ قطبن
۹۰ قادر
۹۱ قاسم شاہ

(ر)

۹۲ رسکھان
۹۳ رس لین
۹۴ رجب علی
۹۵ سید رحمت اللہ بلگرامی

(ش)

۹۶ شیخ
۹۷ شاہ شفیع
۹۸ شاہ ہادی
۹۹ شیخ گدائی
۱۰۰ شیخ سلیمان
۱۰۱ شیخ شاہ محمد بلگرامی

(ت)

۱۰۲ تاج
۱۰۳ تیغ علی
۱۰۴ تراب

(ذ)

۱۰۵ ذوالقرنین

بی این چوبے

میرا ایک دوست

میرا ایک دوست ہے۔ کالج کا ساتھی۔ نہایت دلچسپ ظرافت کا پتلا۔ اگر تم اس کی بے تکلف صحبتوں میں بیٹھو تو وہ تمہیں اتنا ہنسائے گا کہ شاید تمہارے رخسار درد دینے لگیں۔ تم شائد اس کی زندگی پر رشک کرنے لگو گے۔ تم سمجھو گے کہ اس کی زندگی آلام و مصائب سے پاک اور مسرتوں سے لبریز ہے۔ لیکن مجھے اس کی زندگی کا ایک راز معلوم ہے۔ وہ راز جسے آج تک اس نے سوا میرے ہر ایک سے چھپا رکھا ہے۔

"آج میں تمہیں سب کچھ سنا دوں گا" اس نے کہا تھا "اس لئے نہیں کہ دنیا کے لئے درس عبرت ہو۔ اس لئے نہیں کہ بھٹکے ہوئے اس کو سن کر راستے پر آجائیں۔ نہیں مجھے بڑے بڑے دعوے کرنے نہیں آتے۔ میں سناؤں گا صرف اس لئے کہ بس سنا دینا چاہتا ہوں۔ دل میں ایک جذبہ ہے جو رہ رہ کر مجبور کرتا ہے کہ میں سب کچھ سنا دوں تمام دنیا کو۔ دنیا کے تمام افراد کو — خاموش بہتی ہوئی ندیوں کو۔ سر ٹپکتے ہوئے آبشاروں کو۔ اڑتے ہوئے بادلوں کو ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو جگمگاتے ہوئے چاند کو زمین کو آسمان کو — میں اپنی کتاب زندگی کے اوراق کو بکھیر دینا چاہتا ہوں۔ تمام دنیا میں۔ کائنات میں۔ میں اپنی آواز کو پھیلا دینا چاہتا ہوں فضائے بسیط میں خلائے ارض و سما میں — لیکن نہیں۔ یہ اس کا وقت نہیں ہے۔ سوائے اپنا مذاق اڑا لینے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے اظہار کے لئے صرف وہی لمحہ مناسب ہے جس کے بعد زندگی میں دوسرا لمحہ آنے والا نہ ہو۔

تمہیں معلوم ہے نا۔ بلکہ اکثر احباب کو بھی کہ کالج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مجھے مجبوراً ٹیوشن کرنا پڑتا تھا۔ غریبوں کے لئے بھی تو ایک لے دے کر سہارا ہے۔ لیکن باوجود ٹیوشن کی سخت ترین ضرورت کے میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بلا وجہ جھڑکا جاؤں اور خاموشی کے ساتھ سب کچھ سہتا رہوں۔"

"ہاں وہ بڑی خراب فطرت کا آدمی ہے" لوگ کہتے ہیں۔ "بھئی وہ بڑا مغرور شخص ہے بڑا احسان فراموش" لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پیچھے کیا حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ راز ہے جسے میں نے آج تک سینے میں محفوظ رکھا۔ لیکن آج تمہیں سنا رہا ہوں کہ شاید کچھ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے محض اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایسا نہیں کیا بلکہ عمداً۔ شائد وہ مجھے نکال دینا چاہتے تھے لیکن وہ کوئی الزام مجھ پر نہ دھر سکتے تھے۔ میں پابندی سے جاتا تھا۔ روحی جو بلا کی ذہین تھی اور جسے پڑھانے میں کبھی میں نے وقت محسوس نہیں کی۔ کبھی فیل نہیں ہوئی۔ اس نے انعامات! وظیفے حاصل کئے۔ تم جانتے ہو ان دنوں میں نے کتنی تکالیف اٹھائی ہیں۔ روزانہ کالج جانا اور پھر اتنی دور کی چکر ٹیوشن کے لئے صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مجھے مسلسل دماغی محنت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں روحی کے ہاں برابر جایا کرتا تھا۔ سرما کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا، گرما کی جھلسا دینے والی دھوپ میں گرم لو کا مقابلہ کرتا ہوا۔ بجلی کی دل دہلا دینے والی گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کا سامنا کرتا ہوا پانی سے شرابور میں وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور شائد تم اندازہ نہ کر سکو کہ روحی کی معصوم بھولی بھالی باتوں میں میں ان تمام تکالیف کو کس آسانی سے فراموش کر دیا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر یہ ٹیوشن چھوٹ جائے تو پھر میرے لئے مصیبت کا سامنا ہو لیکن یہ بھی میں محسوس کرتا تھا کہ اس دن بھی جس دن میرے پاس وہاں نہ جانے کی کافی وجہ ہوتی تھی۔ مجھے بغیر گئے چین نہ پڑتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ بہت دن ہو گئے یا صرف چند مجھے ٹھیک یاد نہیں میں نے گننے کی کوشش نہیں کی۔ تم جانتے ہو انسان کی فطرت کو۔ سمجھتا ہے دنیا ایک ہی حالت پر قائم رہے گی۔ جانتا ہے۔ دیکھتا ہے ہر روز بلکہ ہر لحظہ کہ دنیا بدل رہی ہے۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے۔

خود اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے خوش ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اُسے سمجھانا بھی چاہے تو وہ اسے سننے اور سمجھنے سے انکار کرنے لگتا ہے یہی میں نے بھی کیا۔
ابھی میری تعلیم کی تکمیل کو ایک سال باقی تھا کہ ایک انقلاب آیا۔ اس دلچسپی نے جو مجھے روحی سے اور روحی کو مجھ سے ہو چلی تھی۔ روحی کے والد کے دل میں شاید خوف پیدا کر دیا کہ کہیں یہ دلچسپیاں کچھ رنگ نہ لائیں۔ اور یہی اصل سبب ہے ان کے مجھے نکال دینے کی کوشش کرنے کا۔ یوں تو شروع ہی سے نہ کوئی ملنسار یا خلیق آدمی نہ تھے مگر ان دنوں ان کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

اُس دن جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ غصہ کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ بلاوجہ ہاں بالکل بلاوجہ انھوں نے مجھے اس طرح جھڑک دیا کہ میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں ۔۔۔ تعجب کرتے ہو دوست! اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ ابھی زندگی میں تم نے قدم نہیں رکھا ہے۔ زمانہ تمھیں سب کچھ معلوم کرا دیگا۔ میں فریبِ زمانہ سے ابھی ناآشنا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ خون جوش کھانے لگا۔ مگر پھر بھی بغیر ایک حرف زبان سے نکالے خاموشی سے اٹھ کر سیدھے گھر چلا آیا اس ارادہ سے کہ اب یہاں پھر کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ ان کی تدبیر کارگر ہو گئی۔ میں نے اسے بہت آسان سمجھا تھا جب تک میں اور روحی ملتے رہے میں اس سے قطعی لاعلم رہا کہ اس سے ملنا میرے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ جس طرح کہ دولتمند انسان فاقہ کی تکلیف کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا۔ جس طرح چشمے کے کنارے بسنے والا پیاس کو ایک معمولی خواہش تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی اس وقت اس سے جدائی کے بار کو محسوس نہ کیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی اس وقت کی حالت کو بیان کر سکیں جب یہ خیال آتا ہے کہ بغیر اس سے ملے بغیر اسے بتلائے ہوئے کہ روحی میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں میں چلا آیا۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ زندگی میرے لئے سوہانِ روح بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا خیال جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کوئی قلبی تعلق نہیں ہے مجھے راتوں کو چین سے نہ سونے دے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا خیال جسے اُس کا وجود سامنے آ کر دبا دیا کرتا تھا اُس سے دور ہوتے ہی میری زندگی پر چھا جائے گا۔ آگ کی دبی ہوئی چنگاری تیز ہو رہی ہے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ میرے خرمنِ عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ نہیں میری زندگی ہی بھسم ہو کر رہ جائے گی۔

روحی ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ دولت اس کے قدموں میں کھیل رہی ہے۔ سیکڑوں ایسے سامان اس کے گرد و پیش ہیں جو میرے خیال کو اگر وہ اس کے دل کے کسی گوشے میں موجود ہے بہت جلد نکال باہر کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جلد اور بہت جلد مجھے بھلا دے گی۔ یا ممکن ہے بھلا چکی ہو۔ اور شاید یہی بہتر بھی ہے۔ کیونکہ اب ہم دونوں دور ہو چکے ہیں۔ ایک ہی جگہ رہ کر بھی بہت دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شاید اب اس دنیا میں پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ لیکن میرے لئے اسے بھلا دینا ناممکن ہے۔ دل میں رہ رہ کر ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو مجھے مجبور کرتا ہے کہ کسی طرح اس سے مل لوں۔ لیکن غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس در پر پھر جاؤں جس سے اس بری طرح نکال دیا گیا۔ اسی ذہنی کشمکش میں اکثر میری تمام تمام راتیں گذر جاتی ہیں۔ کئی دفعہ راتوں کو ماں میری سسکیوں کی آواز پر چونک پڑی ہیں۔ اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے آنسو صاف کرتے پکڑ لیا ہے۔ لیکن دن کو اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے میں قہقہے لگاتا ہوں ہنستا ہوں ہنساتا ہوں۔ میری فطری ظرافت بالکل مردہ نہیں ہو گئی ہے۔ وہ میری بہت مدد کرتی ہے۔ اس طرح دنیا کے اسٹیج پر اس کے باوجود کہ میرا دل روتا رہتا ہے۔ ایک مسرور آدمی کا پلاٹ ادا کئے جاتا ہوں۔ لیکن یہ قہقہے مجھے بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ اور پھر رات میں مجھے آنسو بہا کر ان کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔

اُس کی آنکھیں آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ گلدان کے پھولوں پر وہ نظریں جمائے تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ ایسے میں دو دوست آ گئے۔ اس نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ برج شروع ہوا پھر وہی میرا دوست تھا اور مذاق۔ وہی ہنسنا اور ہنسانا۔ لیکن آج پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اس کے قہقہے بناوٹی ہیں اور اس کا دل رو رہا ہے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز منظرِ عام پر لایا جائے۔ وہ یقیناً بہت غصہ ہوگا لیکن اس کے اظہارِ خفگی سے قبل ہی میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔

محمد دلاور خاں مہدوی

سب رس — اگست ۱۹۳۸ء

انسانوں سے ویران اور فطرت کے مناظر سے آباد، بالاگھاٹ کے دامن میں ایک درہ ہے اس میں سے ہوتا ہوا ایک راستہ انسانی آبادیوں کی طرف جاتا ہے جس سے کبھی کبھی صبح یا شام میں دو چار بیل گاڑیاں اور دو چار گھوڑے گذرتے ہیں۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ایک چشمہ بھی ہے جو خورداد اور تیر کے آتشی مہینوں میں پیاسے جانوروں کو سیراب کرتا ہے۔ تین تین میل دور کے جانور پانی کے لئے وہیں جمع ہوتے ہیں اور گھڑی بھر کے لئے ٹھیر کر واپس چلے جاتے ہیں۔ شاید آتشی مہینوں میں یہاں کی بہاریں لوٹتے ہوں۔

چشمہ ایک پرانے آم کے درخت کے نیچے ہے جس کی عمر کوئی نہیں بتلا سکتا اور جس کے آم کسی نے ابھی تک نہیں کھائے بوڑھا درخت ہمیشہ جوانی کی بہاریں بکھیرتا رہتا ہے اس کے ہمسائے نیم کے ان گنت درخت ہیں جو پتھر کو پگھلانے والی گرمیوں میں دلربایانہ اداؤں سے جھومتے رہتے ہیں مغربی سمت میں کچھ دور پر سنکیسر کے بے شمار درخت سرخ چادریں اوڑھے ہوئے بہار کی دلہن معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا اوپر نظر اٹھتی ہے تو "کالے سیوری" کا وہ عظیم الشان درخت نظر آتا ہے جو اطراف میں پچاس میل سے زیادہ تک اپنی رفعت کی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ شاید یہہ فطرت کی اس چھوٹی سی سلطنت کا علم بردار ہو۔

میرا زیادہ وقت اسی جگہ گذرتا ہے۔ یہاں کا پتہ پتہ میری نظروں میں ہے۔ مجھے یہاں کی وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں ایک چرواہے کا بچہ مرگیا تھا اس کا واقعہ یوں ہے کہ وہ اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے "ناگ پھنی" کی ایک پیڑ کے قریب پہنچا۔ اس کو لوہے کی ایک کڑی پیڑ پر اس طرح پڑی نظر آئی گویا درخت کی جڑ زمین سے باہر نکلی اور پھر اندر مڑگئی ہے اس نے کڑی اٹھائی جس کے ساتھ ہی لوہے کی زنجیر بھی تھی۔ اس نے زنجیر کھینچی اور کھینچتا گیا، کوئی بیس گز زنجیر کھینچ کر تھک گیا۔ زنجیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زرزراتی ہوئی اپنے مقام پر پہنچ گئی۔ لڑکا وحشت کے مارے زمین پر گر گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔ حسب معمول کڑی اب بھی پیڑ پر نظر آتی ہے لیکن اس کو چھونے کی کسی میں ہمت نہیں۔

اس کوہستانی سلسلے سے کچھ دور جانے کے بعد سیاہ زمین شروع ہوجاتی ہے اور ڈھونڈے سے نہ تو پتھر ملتا ہے اور نہ سایہ کے لئے درخت ان ابلتی گرمیوں میں یہہ معلوم ہوتا ہے کہ پیروں تلے ظلمات ہے اور سر پر غصیلا آفتاب ——— آفتاب حشر، کسان اپنے جھونپڑیوں کی گز گز بھر کی اونچی دیواریں اسی ظلمات کو شرمانے والی مٹی سے بناتے ہیں لیکن بنیاد میں پتھر ڈالنے کے لئے اسی پہاڑی پر آتے ہیں۔

میں اپنی محبوب جگہ چشمے کے کنارے بیٹھا ——— "ہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یا دہے اب بھی" ——— گنگنا رہا تھا، دور پہاڑی کی نصف بلندی سے کچھ اوپر ایک بیل گاڑی نظر آئی، دو تین سیاہ اور تقریباً عریاں انسانی شکلیں اس میں پتھر بھر رہی تھیں گاڑی نصف سے زیادہ بھر چکی تھی گاڑی کے بیل اچانک پلٹ گئے۔ ان کا پلٹنا تھا کہ گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوی دامن کی طرف چلی۔ آٹھ یا نو قلابازیوں کے بعد وہ ایک خاردار جھاڑی پر جاکر رک گئی۔ میں اس کے رکنے تک دوڑتا ہانپتا نصف سے زیادہ راستہ طے کر کے پہاڑ کی کچھ بلندی پر چڑھ چکا تھا میرے گاڑی کے قریب پہنچتے تک کسان بھی گاڑی کے پاس آگئے۔ وہ زیادہ شکستہ نہیں ہوی تھی اور ابھی قابل استعمال تھی ہم سب نے اس کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کردیا۔ بیل جو پہلی ہی الٹن میں گاڑی سے الگ ہو گئے تھے لاکر لگا دئے اور جنھوں نے اشارہ پاتے ہی گاڑی کو اوپر پہنچا دیا میں نے کسانوں سے پوچھا کہ وہ ان پتھروں کو کہاں لے جارہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ بارش کا پانی نالا بنتا ہوا کھیت میں سے بہتا ہے اور

ہر سال دو سال میں اس کا راستہ بدلنے کے لئے کھیت کے کنارے پتھر ڈال کر اس کی سطح برابر کرنی پڑتی ہے۔ اُف۔ غریب کسان اتنی محنت کے باوجود روٹی کے ایک ٹکڑے اور موٹی کھادی کی گز بھر دھجی کے لئے محتاج۔ اب میں

جس کھیت سے انساں کو میسر نہ ہو روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش سے پڑھتا ہوا اپنے "رکنا باد" کی طرف واپس ہوا۔

مغرب ہو رہی تھی اور میں وضو کرنے کے لئے قمیص کی آستینیں چڑھا رہا تھا کہ اڑ دھڑ ادھڑ کی آوازیں سنائی دیں یہ تو روز ہی ہوتا تھا اس لئے میں نے کوئی توجہ نہ کی اور وضو کر لیا جب نماز کے لئے تکبیر کہہ رہا تھا تو ایک شخص میرے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ "میاں! میری گاڑی کا کتّا ٹوٹ گیا ہے۔ اب میں کیا کروں" میں اس آدمی کو جانتا تھا اس لئے اس سے کہا کہ تم ہمارے کھیت تک جاؤ اور وہاں سے ہماری گاڑی لے آؤ۔ نشانی کے لئے میں نے اپنا ریشمی رومال اس کے حوالے کیا تا کہ میرے ملازمین میرے حکم کی تعمیل میں عجلت کریں۔ میں نماز پڑھ کر اس کی گاڑی کی طرف چلا گیا جب گاڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ کتّا بے ترتیب زینہ نما راستہ کی تاب نہ لا کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور میں تنہائی شدت سے محسوس کر رہا تھا فطرت کے مناظر ظلمت کے پردوں میں چھپے جا رہے تھے "رکنا باد" میری نظروں میں ویران نظر آ رہا تھا کیونکہ اب یہ مقام انسانوں اور فطرت کے مناظر دونوں سے بھی غیر آباد ہوتا جا رہا تھا میری وحشت اس لئے بھی بڑھ رہی تھی کہ یہاں ناگ پھنی میں ایک شیر رہتا ہے اب اس کے پانی پینے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مجھے اپنی اتنی زیادہ فکر نہ تھی جتنی غریب کسان کے بیلوں کی کیونکہ شیر آدم خوار نہ تھا اور اسی وجہ سے گاؤں کا بچہ بچہ بھی اس سے واقف تھا اس شیر کا شکار عموماً کتنے اندھے نحیف اور معذور گھوڑے گدھے اور زخمی ہرن تھے۔ کسی نے آج تک یہ نہیں سنا کہ اس نے کوئی طاقتور او جوان جانور مارا ہو حالانکہ ایسے جانور اس پہاڑی کے دامن میں اور اوپر میدانوں میں چرتے رہتے تھے اس لئے کچھ ڈھارس بھی بندھتی کہ وہ اپنی عادت کے لحاظ سے ہمیں کچھ نہ کرے گا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ اڑ دھڑ ادھڑ کی آواز سنائی دی اور چند لمحے بعد میری گاڑی لئے ہوئے چار آدمی آ گئے۔ قندیل بھی ساتھ تھی۔ ان چاروں نے کپاس کے ان بوجھوں کو میری گاڑی میں منتقل کیا اور ساتھ لایا ہوا کتّا ٹوٹے ہوئے کتنے کی جگہ لگا دیا۔ اب ہم دونوں گاڑیاں لئے ہوئے اپنے کھیتوں پر آ گئے میں نے کسان سے کہا کہ آج کل کپاس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے پھر وہ فروخت کرنے میں کیوں عجلت کر رہا ہے اس نے کہا مجھے اس "ہفتے" کی تحصیل ادا کرنی ہے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں سوائے کپاس کی فروخت کے کوئی چارہ نہیں میں نے اس کا جواب سنا اور جگر تھامے ہوئے

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری　　خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

گنگناتا ہوا گھر آ گیا۔

اکبر صدیقی

غزل

نگۂ ناز پڑی دل پہ جو نشتر بن کر!　　بہہ گیا خونِ دل آنکھوں سے سمندر بن کر
ہوں میں وہ بلبلِ ناشادِ گلستانِ الم　　پھول بھی سر پہ برس پڑتے ہیں اخگر بن کر
شبِ فرقت میں مہ نو نہ دکھا اپنی ضیا　　کاٹتی ہے تری صورت مجھے خنجر بن کر
ہائے ناسازیٔ قسمت کا گلہ کس سے کریں　　آپ ہی آپ بگڑتا ہے مقدر بن کر
ناز تھا جس دلِ نادان پہ تجھ کو منصور　　وہی پہلو میں کھٹکنے لگا نشتر بن کر

محمد احمد اللہ خان منصور حیدرآبادی

فلمی افسانے کی خصوصیات

انسان میں تحقیق و تفتیش کا مادہ جبلی طور پر موجود ہے۔ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کا بڑا شایق ہوتا ہے اس کو آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی بھاتی ہے۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مطالعہ ہی اس کے لئے کافی عبرت آموز ثابت ہو سکتا ہے مگر اس کی طبیعت صرف زندگی کے واقعات و حالات سے سیر نہیں ہوتی۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قصہ اور کہانی کی ابتداء ہوی اور قدیم زمانے میں عرصے تک حکایتوں اور قصوں ہی کے ذریعے ہدایت و تعلیم دی جاتی رہی۔ ابتداء میں محض فرضی داستانوں اور دیو پری کی کہانیوں میں خاص لطف آتا تھا لیکن بتدریج عقلِ سلیم کی روشنی نمودار ہوتی گئی۔ آخراب وہ زمانہ بھی آگیا کہ افسانہ میں تاوقتیکہ زندگی کا اصلی رنگ اور سچے جذبات و خواہشات کا اظہار نہ ہو وہ ایک مہمل و بے اثر داستان معلوم ہوتا ہے۔

ڈرامہ کی اصلی غرض و غایت محض ایک افسانے کو عملی صورت میں پیش کر دینا ہے۔ چونکہ افسانوں سے محض وہی حظ اٹھا سکتے ہیں جو نوشت و خواند سے واقف ہوں ڈرامے سے لطف اندوز ہونے میں علمی کم مائگی حارج و مانع نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے عوام کو ڈرامے سے زیادہ دلچسپی رہی پہلے پہل اس میں مذہبی رنگ کی چاشنی بھی تھی۔ اِس لئے تمام مہذب ملکوں میں مثلاً یونان، روما اور ہندوستان میں جہاں آریا قومیں آباد تھیں ڈرامہ کا زور ہوا اور موسیقی کے ساتھ یہہ اعلےٰ فنونِ لطیفہ میں شمار ہونے لگا۔ اس کو مکمل فن اور علم کی صورت میں پیش کرنے کا فخر صرف ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔ چاہے ہندوستان والے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خود یورپ والے مانتے ہیں۔

فلم دراصل ڈرامے ہی کی ایک متحرک اور ناطق تصویر ہے۔ اس لئے فلمی افسانے میں بھی ان تمام خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جو ایک عمدہ ڈرامے کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اب سوال یہہ رہتا ہے کہ عمدہ ڈرامہ یا فلمی افسانے کے لئے کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اس کے جواب میں لمبے چوڑے منطق کی ضرورت نہیں، معمولی سے آدمی بھی اس بات کو باسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب ہم کہانی یا افسانہ کا خیال کرتے ہیں تو اس میں ایک مخصوص عنصر مضمر ہوتا ہے یعنی "**انسان کی عام اور ہمہ گیر دلچسپی کا تعلق**" پس ڈرامہ ہو یا فلمی افسانہ وہ بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا مقصد یہہ نہیں کہ فرضی و قیاسی باتوں کو اصلیت پر ترجیح دی جائے بلکہ اس کی مدد سے حقیقت کو صحیح لباس پہنا کر اس طرح سامنے کھڑا کر دیں کہ طبیعتیں اچاٹ نہ ہونے پائیں۔ ورنہ افسانے کی مثال ایک ایسی تصویر کی سی ہوگی جو صحیح تو ہے مگر قدرتی رنگ اور روپ سے عاری ہے یعنی ایک بے جان مرقع ہے جس کے مشاہدہ سے ہمارے محسوسات پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور قلوب نیکی و اصلاح قبول کرنے کے بدلے منغض ہو جاتے ہیں اس لئے افسانے میں چند باتیں لازمی طور پر عام اور ہمہ گیر دلچسپی قائم رکھنے کے لئے ایجاد طلب ہوتی ہیں مثلاً افسانے کی ترتیب۔ کردار کا نشو و نما اور تکمیل۔ ان تمام چیزوں کو اس عمدگی کے ساتھ پورا کیا جائے کہ نفسِ افسانے میں کوئی نقص نہ آنے پائے۔ تصنع اصلیت و حقیقت کے نیچے دب جائے اور افسانے کے واقعات ایک حد تک عریاں حالت میں نظر آئیں یہہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ افسانے میں محض خیالات کی بلند پروازی دکھلانے کی بجائے اپنی گرد و پیش کی دنیا کا غائر مطالعہ کریں اور افسانے میں انھیں واقعات و کردار کو ترتیب دیں جو چشم دید ہوں۔ اور جن کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا ہو جس میں محض "وہم و خیال" سے کام نہ لیا جائے بلکہ قوتِ مشاہدہ غالب ہو یوں تو یہہ کام نہایت آسان معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہہ اس قدر آسان نہیں جتنا کہ بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص میں فطرت کے سمجھنے کی صلاحیت اور انسانی

جذبات وخیالات کا صحیح احساس نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی قابلیت اور دماغ و ذہن کو خاص طور پر ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلے تو ہندوستانی فلم اس وقت تک شیطان، بھوت، دیو، پری کے خلاف قیاس داستانوں پر مشتمل ہیں اور اگر چند فلم سوشیل ہیں بھی تو افسانے کے مخصوص کردار اس دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ فرشتہ یا اس سے مختلف کوئی نوع ہیں یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ انسان عناصرِ اربعہ ہونے کی حیثیت سے اس میں معائب ومحاسن ہونا لازم وملزوم ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو کمال حاصل نہیں۔ معمولی طبائع کا تو ذکر ہی کیا مضبوط سے مضبوط کیرکٹر کے انسانوں کا قدم بھی بعض موقعوں پر ڈگمگا جاتا ہے مگر ہمارے فلموں میں بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی کو ہمیشہ عصمت وعفت کی دیوی اور ہیرو کو عاشق صادق نہایت دلیر اور سورما ظاہر کیا جاتا ہے فلمی افسانوں کے اکثر کردار انتہائی نازک موقعوں پر جب کہ طبائع انسانی کا انقلاب یقینی ولابدی ہے۔ وہ ثابت قدم نظر آتے ہیں جو فطرت بشری کے سراسر خلاف ہے۔ اس قسم کی فرضی وخیالی تصویریں نہایت معیوب ومہلک ہوتی ہیں کیونکہ اس سے ہم دھوکا اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فطرت انسانی کی اصلیت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ اور ایک باطل خیال دل و دماغ پر قائم ہو جاتا ہے جس کا اثر حقیقی طور پر ہمارے قول وفعل پر پڑ کر ہم کو راہ راست سے بھٹکا دیتا ہے۔

بعض حضرات افسانے کے واقعات کو فطرت کے مطابق پیش کر دینا مخربِ اخلاق تصور کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے افسانے پسند کرتے ہیں جس میں برائی کی مذمت اور نیکی کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا کر مبالغہ کے انتہائی درجے تک پہونچ گئے ہوں جس سے ناظرین کے دلوں پر اندر ہی اندر اس غلط وعظ وپند کا الٹا اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے خراب پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور صرف اس کی اچھی باتیں ظاہر کی جائیں جو یقیناً بعید از انصاف وخلافِ فطرت ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانے کی اصلی غرض اصلاح ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے بعض مخصوص کرداروں کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی کمزوریوں سے کہیں زیادہ بھلائیوں کا اظہار کیا جائے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام کمزور پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف خوبیاں ہی ظاہر کی جائیں جس کی وجہہ سے وہ اوصاف واطوار بشریت سے بعید ہو جائیں۔ گو اکثر نقاد انگریزی فلموں اور افسانوں کو فطرت کے بالکل مطابق سمجھتے ہیں اور ان کی تعریف میں اخبارات ورسائل کے کالم سیاہ کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یورپ میں ایسے ڈراموں اور ناولوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جس میں مادی زندگی اور خوش آئند باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک نہیں ہو سکتے۔ البتہ اتنی خوبی ضرور ہوتی ہے کہ ان میں بظاہر کوئی بات خلافِ فطرت نظر نہیں آتی وہ جھوٹ پر سچ کو اس طرح لپیٹتے ہیں جس طرح قرص کونین پر مٹھاس ہوتی ہے لیکن حلق سے نیچے اترتے ہی خون میں کڑواہٹ اثر کرنے لگتی ہے یہی وجہہ ہے کہ وہاں ریاکاری تہذیب کا شعار بن گئی ہے۔

بہر حال میں اس امر پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ وہی افسانہ کامیاب اور حقیقی معنی میں اصلاح کا حامی ہو سکتا ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے خواہ وہ واقعات شیریں ہوں یا تلخ البتہ ان کو زیب وزینت دے کر خوشنما اور پسندیدہ بنانا ضروری ہے مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسی میں سب سے بڑی پند ونصیحت ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ بلحاظ مذاق افسانوں کے طرز ادا میں تبدیلی ہو مگر ان کی فضیلت کا معیار اسی پر منحصر ہے کہ افسانے کے کردار فطرت وقدرت کے مطابق ہوں تا کہ عوام الناس اپنی اصلی صورت اس آئینہ میں دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے آصفیہ ڈرامٹیک اسوسیئیشن حیدرآباد میں ......

"Cinema is the mirror of the nation" (سینما قوم کے لئے آئینہ ہے) کے عنوان سے تقریر کی تھی جس کا حاصل یہی تھا۔

"جس طرح آئینہ دیکھنے سے چہرہ کی خوبی اور برائی بلا کم و کاست ہمارے سامنے آجاتی ہے اسی طرح فلم اور ڈرامے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ قوم کے مصائب و محاسن کی سچی ترجمانی کرے" سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے کہ افسانے کی ترتیب اور کردار کا نشو و نما و تکمیل ہی ایک ایک فلم کی کامیابی کے لیے نہایت لازمی چیز ہے اور اسی سے افسانہ نگاری کے کمالِ فن کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں اکثر کردار محض واقعات سے چسپاں کردئے جاتے ہیں اور ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے جس کی وجہہ وہ بے اثر اور اکثر خطرناک ہوجاتے ہیں۔

جس طرح مصور ایک مرقع کھینچتا ہے تو پہلے گرد و پیش کے مناظر موقع و محل کے لحاظ سے اتارتا ہے پھر اپنی تصویروں کو ان کے حسب حال ترتیب دے کر باہمی نسبت و تعلق اور ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یعنی دور کی چیزوں کو نزدیک کی چیزوں سے چھوٹی اور نزدیک کی چیزوں کو نمایاں کرکے تناسبِ اعضا میں فرق نہیں آنے دیتا بعینہٖ یہی حال افسانہ کی ترتیب و کردار کے نشو و نما کا ہے لیکن اس کے برعکس ہندوستانی فلموں کے کردار بالکل لغو طریقہ سے نمایاں کئے جاتے ہیں جس سے کسی قسم کا مفید نتیجہ مترتب نہیں ہوسکتا۔ اسی سلسلے میں مکالمہ کے متعلق بھی بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ مکالمہ ہی افسانہ اور ڈرامہ کی روح ہے۔ مکالمہ تحریر کرتے وقت موزوں الفاظ کا انتخاب ان کی مناسب نشست و ترتیب محاورات، استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے اور یہہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کی ذراسی بھول چوک سے افسانے کے تمام اثرات زائل اور مطالب فوت ہوجاتے ہیں۔ مکالمہ نگار کو کردار کی فطرت کا نہایت دقیق مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کردار کے خیالات و جذبات کے اظہار میں کس قسم کے لہجے کس طرح کی عبارت استعمال کرے کہاں اختصار اور کہاں تفصیل سے کام لے زبان کیسی ہو خیالات کس طرح ادا کئے جائیں اور یہہ ایک نہایت ہی مشکل و دشوار امر ہے جس پر ہر کوئی قادر نہیں اس کے لئے بڑی زبان دانی اور خداداد قابلیت کی ضرورت ہے مکالمہ میں زیادہ تفصیل غیر ضروری ہوتی ہے کیونکہ زیادہ تر خیالات کا اظہار لب و لہجہ حرکات و سکنات کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ مکالمہ لکھتے وقت مکالمہ نویس کا فرض ہے کہ وہ کردار کی ہستی میں گم ہوجائے ورنہ ڈرامے کی روح غائب ہوجائے گی اور مکالمہ بے اثر و مضحکہ انگیز ہوجائے گا۔ مکالمہ کی غرض و غایت محض جملوں کو ترتیب دے کر مطلب ادا کردینا نہیں بلکہ اس میں ایک قوت، جوش اور ولولہ ہو جو اداکاری کے بعد دلوں پر نشتر کا کام کرے اور روح کو بیدار کردے۔ اور اس کا ہر لفظ ایک ایسا ترانہ ہو جس کے مسرت انگیز اور درد بھرے راگ سے اہلِ مجلس تڑپ اٹھیں۔

فلمی افسانے میں ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ ڈرامے اور فلمی افسانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح قصہ اور کہانی میں واقعات از اول تا آخر تمام باتوں کو راز میں رکھے بغیر بیان کردے جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈرامے میں تمام واقعات نمایاں کردئے جاتے ہیں۔ لیکن فلمی افسانے میں یہہ بات نہیں بلکہ اس کی ترتیب ناول کے طرز پر ہوتی ہے جس میں بعض باتوں کو راز میں رکھا جاتا ہے جس کا افشا خاتمہ پر ہوتا ہے اس قسم کی ترتیب نہایت مشکل ہے کیونکہ اس کے ذریعے افسانے کے تاثرات کو قوی بنادیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ عدم واقفیت کی بنا پر ہمارے فلمی افسانوں میں یہہ ترتیب بالکل ادھوری اور بے جوڑ ہوتی ہے جس سے کردار کی ساری خوبیاں دب جاتی ہیں اور فلم کا مقصدِ اصلی مفقود ہوجاتا ہے۔

اگر ہندوستانی فلموں کو میرے پیش کردہ معیار پر جانچا جائے تو شاید ہی کوئی ہندوستانی فلم حقیقی معنی میں فلم کہلانے کے قابل ہوگا۔ اس کا مطلب یہہ نہیں کہ ہندوستان میں قابل افسانہ نگاروں کی کمی ہے بلکہ فلم سازوں کی بدذوقی کی وجہ سے بہترین افسانہ نگار اس وقت تک اس طرف متوجہ نہیں ہوے اگر ہمارے فلم ساز خواب غفلت سے چونک کر ہندوستانی ادیبوں کی قدردانی اور عزت افزائی کا عملی طور پر ثبوت دیں تو کوئی وجہہ نہیں کہ ہندوستانی فلم بھی حقیقت میں فلم کہلانے کے مستحق نہ ہو جائیں۔

محمد حسام الدین خاں غوری (سکندرآباد)

تجدیدِ شوق

یہہ بے قرار نظریں یہہ شرمسار نظریں
تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

روحِ خموش ہمدم بیدار ہو رہی ہے
پھر دل کی آج دھڑکن غمخوار ہو رہی ہے
تاروں نے پھر الٹ دی رخ سے نقاب ترکیں
پھر گدگدا رہی ہے ان کو فضائے سیمیں!
کرنوں کا آسماں پھر جھولا بنا رہا ہے
پینگوں سے پھر صبا کے ان کو جھلا رہا ہے
ایسے میں یاد میری ان کو ستا رہی تھی
ہاں چھیڑ چھاڑ پچھلی یا یاد آ رہی تھی
ٹھکرا کے بندشوں کو بے تاب ہو کے آئیں
آنکھیں ہیں سرخ کیوں یہہ شاید ہیں رو کے آئیں

تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

یہہ کہہ رہی ہیں مجھ سے اے کشتۂ محبت
بیگانۂ حقیقت دیوانۂ محبت!!
دنیا فریب ناداں چل دور اس جہاں سے
بے درد کی زمیں سے ظالم کے آسماں سے
نورِ شفق کے اندر دنیا نئی بسائیں
قوسِ قزح سے آگے اپنا جہاں بنائیں
اس دلنشیں جہاں میں اک باغ پھر سجائیں
کرنوں کی ڈالیوں میں شبنم کے گل کھلائیں
اس باغ میں ہمیشہ موجِ بہار آئے
انساں کی قوتوں سے قدرت بھی جھینپ جائے
بے دردیاں جہاں کی واں ہم عناں نہ ہوں گی
الفت کی داستانیں رسوا وہاں نہ ہوں گی

تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں
یہہ بے قرار نظریں یہہ شرمسار نظریں

نظر (حیدرآبادی)

شیطان کی آنت پر ایک نظر

" توقع " کے مطابق لیکن " توقع " کے خلاف ہمیں یہ مضمون وصول ہوا۔ توقع کے مطابق اس لئے کہ ہم " شیطان کی آنت " کے جواب کو ضروری تصور کرتے تھے اور توقع کے خلاف اس لئے کہ اس میں سنجیدگی سے ہٹ کر موقتی جذبات کا اظہار کیا گیا۔ مذہب کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ موجودہ سماج کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شیطان کی آنت کا باعث مرد بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح ایک عورت ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں؟ " شیطان کی آنت " کے مصنف یا ان پر تبصرہ کرنے والے خواہ کچھ ہی کہیں لیکن ہم تو جاہل عورتوں اور مردوں کی ہرزہ سرائی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں —— اس لئے کہ وہ احمق بہت بڑا احمق ہے جو اپنی حماقتوں کو خاموشی میں دفن کر دیتا ہے علم و حکمت کی عدم موجودگی میں جاہلوں کی یہ ہرزہ سرائی ہی بہت غنیمت ہے —— ان کو علم و حکمت کے نکتے سکھائیے پھر ہمیں امید ہے کہ نہ " شیطان کی آنت " لکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت۔ (ادارہ)

رسالہ سب رس ۱۹۳۸ء جولائی میں ایک مضمون مسمیٰ بہ شیطان کی آنت میری نظر سے گذرا جو ہمارے ایک مسلم بھائی کا تصنیف کردہ ہے۔ ہمارے معزز بھائی نے اس مضمون میں جو واقعہ نگاری کی ہے اور نسوانی کمزوریوں کا خاکہ کھینچا ہے اگر اس پر بنظر غائر روشنی ڈالی جائے تو نہیں معلوم کہ ان اعتراضات کی ذمہ داری کن ہستیوں پر عاید ہوگی۔ قبل اس کے کے کوئی اشتہار جاری کیا جائے یا ایسے مضامین طبع کئے جائیں کہ جس کے مطالعہ سے ناظرین کو نوٹس لینے کا موقع ملے۔ مضمون نگار صاحب کو چاہئیے کہ اس کے نتیجہ پر غور کرے ورنہ (تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد) کا ہی مصداق بن جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ عورت بالطبع کمزور پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصد نہیں کہ وہ تمام عمر لاغر و لاعقل ہی رہے گی۔ دنیا کی ہر چیز کو صیقل کی ضرورت ہے۔ اگر بیش بہا جواہر کو بھی عمدہ تراش و خراش سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا جائے تو اس کی ظاہری حالت ایک معمولی پتھر سے سوا نہ ہوگی۔ اسی طرح انسان کا دماغ بھی صیقل گری کا محتاج ہے کیا عورت اور کیا مرد اگر کسی مرد کی پرورش بھی کسی تہہ خانہ میں یا مکان کی چار دیواری میں مقید رکھ کے کی جائے تو بلا مبالغہ وہ ایک گنوار اور جاہل عورت سے بھی بدتر نکلے گا۔ ایام سلف میں حقوق نسوانی جس بری طرح پامال کئے جاتے تھے وہ مکرر محتاج بیان نہیں ہے۔ غریب عورتیں مردوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح محبوس و مقید رہتی تھیں جیسے کوئی بے بال و پر شکستہ پرندہ ظالم صیاد کے دام میں ہو۔ ان بے زبانوں کا کوئی حامی تھا نہ ہمدرد۔ زمانۂ جاہلیت کی رسم دختر کشی نے تو اس صنف نازک کا قلع قمع ہی کر رکھا تھا ان کی تعلیم و تربیت تو درکنار بیچاریاں اس بری طرح زندہ درگور کردی جاتی تھیں کہ خدا کی پناہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک آیا تو ان مظلوموں کو جفا کار مردوں کے مظالم اور بیدردانہ موت سے نجات ملی اور اسی مسعود و مامون زمانے سے ان کی تعلیم و تربیت کا دور دورہ شروع ہوا اس ہادی برحق نے مظلوم کی دادرسی گمراہیوں کی رہبری کی اگر اور چندے آپ کا وجود مسعود اس ہستئ ناپائیدار میں ظہور پذیر نہ ہوتا تو شاذ صفحۂ دنیا پر ایک عورت کا بھی نام نظر نہ آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جہنم کے سات طبقے ان ظالم اور سیاہ کار مردوں سے بھرے جاتے جو فرقہ نسوان کی عدم موجودگی سے مرتکب جرائم نازیبا ہو کر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرتے۔ من بعد رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا گویا اس طرح سے دنیا کب کی معدوم ہو چکی ہوتی اور خدائی کا منشا بھی ادھورا رہ جاتا۔ لیکن خدائے عزوجل کو اپنی خدائی کا تماشا دکھانا منظور تھا۔ ان ظالموں کو ابدی مصیبت سے بچانے کے لئے رسول مقبول صلعم کو اپنا نبی برحق اور خلق کی شمع ہدایت بنا کر بھیجا۔ اس پر بھی متعدد گھرانے ایسے تھے جہاں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت

باعثِ ننگ وعار خیال کی جاتی تھی مجبور و محکوم عورتیں ستمگار مردوں کی نفسانیت کا تختۂ مشق سمجھی جاتی تھیں اور ان سے مویشیوں کی طرح بار برداری کا کام لیا جاتا تھا ایک زمانۂ دراز تک یہہ طبقہ یوں ہی نا روا مظالم اور نا زیبا جور و ستم کا شکار بنا رہا آخر ان بیکسوں کی فریاد کب تک خالی جاتی۔ اور ستم زدوں کی آہ کیونکر رنگ نہ لاتی خاک دہلی نے چند ایسے افراد پیش کئے جو اس محروں طبقے کے سچے حامی اور حقیقی جاں نثار نکلے جن کے اکثر نام مجھے یاد نہیں۔ جیسے راشد الخیری، نذیر احمد وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات کی سعی بلیغ نے فرقۂ نسواں کا ڈوبتا ہوا بیڑا سنبھالا اور ان کی تعلیم و تربیت کا بارِ گراں اپنے دوش پر اٹھایا۔ ہر گھڑی ہر لحظہ تعلیم نسواں کا راگ گایا جن کی پُر درد صداؤں نے خوابِ غفلت میں سونے والے مردوں کے جذبات خوابیدہ کو جگایا انجام کار حق بہ حق دار رسید کا مقولہ صادق آیا۔ مگر افسوس یہہ دَور اس وقت آیا جب کہ دنیا درجۂ اختتام کو پہونچ رہی ہے۔ (مجلس تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر۔ ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم) کے بہ مصداق آخری زمانے میں عورتوں نے ترقی کی با وجود اس قلیل مدت کے ان ہستیوں نے جو کارنمایاں کئے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ آج دنیا کا کوئی مرد یہہ نہیں بتا سکتا کہ عورتیں کج فہم۔ بے عقل۔ نالائق محض ہیں۔ ہماری رائے میں تو فی زمانہ مرد و عورت میں کوئی تخصیص باقی نہیں اگر کوئی مرد گرانچو ٹ ہے تو عورت بھی اس کے قدم بہ قدم ہے اگر کوئی بڑی خدمت پر ممتاز ہے تو عورتیں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ شاعری۔ مضمون نگاری۔ تقاریر۔ وعظ پند۔ اشاعت اسلام۔ القصہ یہہ تمام خوبیاں مرد ہی کے حصے میں نہیں آئیں بلکہ عورتوں میں بھی اس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے غرض وہ کون سی خوبی ہے جو مرد کے لئے مخصوص اور عورت کے لئے محروم ہو۔ لہذا ہمارے اسلامی بھائی نے جو طبقۂ اناث کی کمزوری۔ جہالت اور بے مغزی کا اظہار اپنے مضمون میں فرمایا ہے کیا وہ یہہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مرد ان اوصاف سے متصف نہیں ہے۔ کیا مردوں کی مجلس میں اس قسم کی ہرزہ سرائی نہیں ہوا کرتی۔ ہوتی اور ضرور ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہاں تک کہ دفتر خلوت کا ہر ورق احباب کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے یہہ ہماری انسانیت و شرافت سے بعید ہے کہ لغو اذکار کو قلمبند کریں لیکن میں پھر بھی یہہ کہوں گی کہ نہ دنیا کے تمام مرد ایسے ذلیل اور نہ تمام عورتیں۔

نہ ہر زن زنست و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ہر طبقے میں ضرور اچھے اور چند برے ہیں۔ الغرض مردوں کو چاہئے کہ اپنی مستورات کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخاست کا موقع دیں تاکہ وہ آداب مجلس سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سوسائٹی سے مطلب پردہ کی مخالفت نہیں ہے کیونکہ میں پردہ کی زبردست حامی ہوں یہہ خیال سراسر غلط ہے کہ خواتین محفلوں میں بے سر و پا گفتگو کرتی ہیں۔ ہاں جب ان کے معلومات ہی محدود ہوں اور گفتگو کا کوئی موضوع نہ ملے تو آخر ان کی قوتِ ناطقہ کس کام میں صرف ہو گی۔ اس لحاظ سے اس بے معنی قیل و قال کا الزام ان کے سرپرست مردوں ہی کے سر رہے گا۔ مرد سے ہمارا مقصد صرف شوہر نہیں ہے بلکہ۔ باپ۔ بھائی۔ بیٹا غرض کنبہ کے تمام مرد ہیں۔ علیٰ ہذا شارع اسلام کا بھی یہی فرمان واجب الاذعان ہے۔

لطف النساء بیگم آثمہ
بنت شمس العلماء شاطر مدراسی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا گروپ
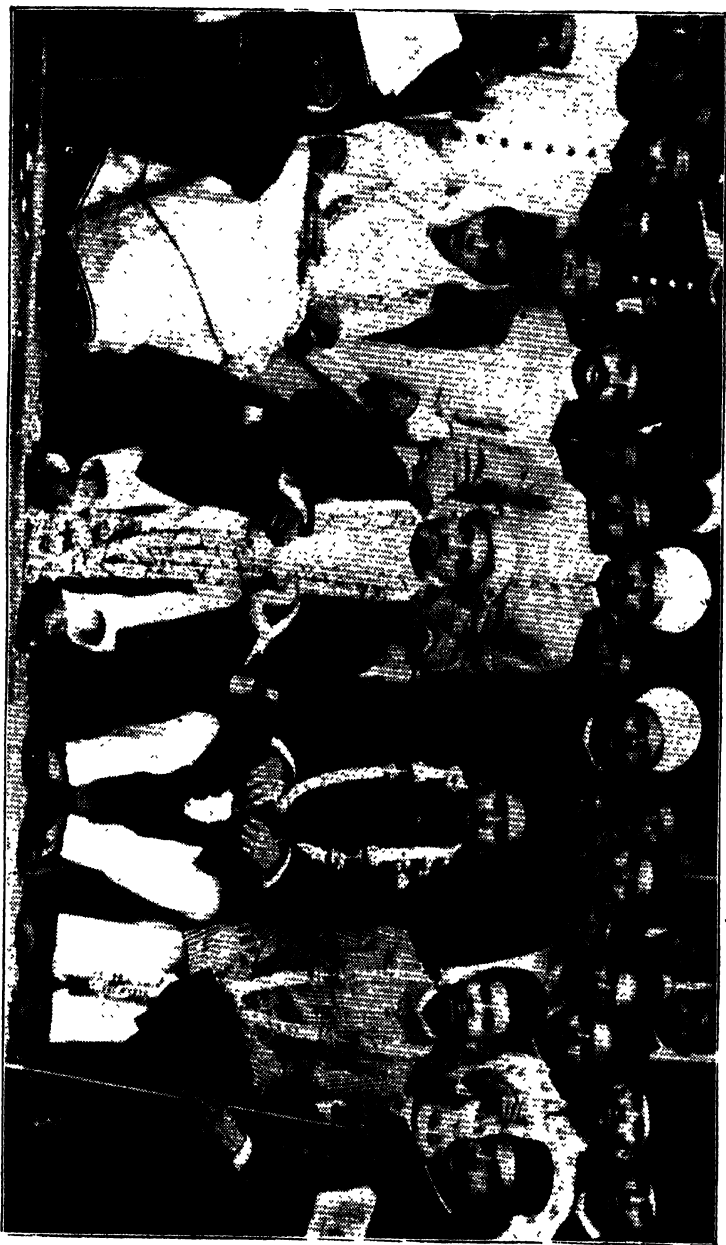
نشستہ سیدھے جانب سے :- (۱) مرزا محمد بیگ صاحب اول تعلقدار (۲) محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم سکریٹری کانفرنس (۳) محمد فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ (۴) سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر (۵) مسز سروجنی نائیڈو (۶) رائے بالمکند صاحب آنجہانی دکن ہائیکورٹ۔

استادہ دوسری صف میں :- (۱) حافظ محمد مظہر صاحب سکریٹری کانفرنس (۲) ایچ ایم سلطان صاحب مرحوم (۳) محمد برہان الدین صاحب منتظم دفتر کانفرنس (۴) غلام محمد صاحب مرحوم وکیل (۵) محمد مسیح الدین مرحوم وکیل (۶) محمد شمس الدین صاحب منصف وظیفہ یاب (۷) محمد غوث صاحب ایم اے ال ال بی۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کے لئے

اِدارۂ ادبیات اُردو کے ماہ نامہ "سب رس" کا ضمیمہ

فہرست

تصاویر
- ۱- گروپ سراکبر حیدری و مسز سروجنی نائڈو وغیرہ
- ۲- محمد عبدالرحمٰن خاں صدر کانفرنس
- ۳- محمد مرتضےٰ مرحوم سابق معتمد
- ۴- سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

پہلا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! یہ بہت نازک اور پُرخطر وقت ہے۔ یورپ میں ایک خونخوار اور خون ریز جنگ ہو رہی ہے جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا بے وجہ و بے گناہ قتل کئے جارہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیتِ رعایا کے اپنے فرض کو بکمال خوبی انجام دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت حضور پُرنور خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی پُرخلوص دوستی کا حق ادا کر دیا جو انھیں اپنے آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے گا اور جبر و استبداد کو پامال کرے گا۔ اس لئے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بے چینی اور پورا اطمینان حاصل ہے اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم آج اس نیک کام کو شروع کرنے والے ہیں اور اس تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں اور ہم سب کو اعلیٰ حضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ کا تہ دل سے شکر گزار ہونا چاہئے کہ از راہِ مراحم خسروانہ اس مجلس کے انعقاد کی منظوری عطا فرمائی ....

حضرات! میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اس تعلیمی مجلس کے قیام سے ملک پر ایسا بڑا احسان کیا ہے کہ جس کا شکریہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ نسلیں بھی ادا کریں گی۔ میری رائے میں اگر اس ملک کے لئے سب سے بہتر اور سب سے مفید اور سب سے اعلیٰ کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ ایک ایسی ہی تعلیمی مجلس ہے اگرچہ یہ کام بہت پہلے شروع ہونا چاہئے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بہت دیر کی ہے لیکن ہم تاخیر کی تلافی ہم اپنی مستعدی جفاکشی اور محنت سے کر سکتے ہیں اور اگر یہ کام اسی جوش اور مستعدی کے ساتھ جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے نتائج کیسے عمدہ اور اس کے اثرات کیسے بے بہا پیدا ہوں گے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس مجلس کی صدارت کے لئے کسی صاحبِ علم و فضل کا انتخاب کیا جاتا جو اس خدمت کو مجھ سے بہتر اور زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دیتا۔ مجھے علم و فضل کا ہرگز دعویٰ نہیں ہے اور یہ میں بغیر کسی انکسار اور تصنع کے کہتا ہوں لیکن میں علم کا خدمت گزار ضرور ہوں۔ اور اس ناچیز خدمت گزاری پر مجھے فخر ہے۔ میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منور ہو جائے۔ مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا۔ تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ اور میں نے اپنی بساط کے موافق ہمیشہ اس میں حصہ لیا اور جب سے میں اس ریاست میں ہوں مجھے سب سے زیادہ خیال تعلیم کا رہا۔ اور جب تک میں رہوں گا۔ میں ہمیشہ اس کی ترقی کو مدِ نظر رکھوں گا اس لیے جو عزت کہ آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اول کی صدارت کی بخشی ہے اس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا ....

حضرات! علاوہ اُن اعلیٰ خوبیوں اور نیکیوں کے جو ہمیشہ عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ ہر زمانہ میں بہ لحاظ ضروریات وقت اور اقتضائے زمانہ بہت سی دوسری ایسی چیزیں اور بہت سے دوسرے ایسے کام ہیں جن کی قدر و منزلت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا درجہ نیکی اور ثواب تک پہونچ جاتا ہے۔ اگر اس زمانے کے حالات اور ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو اشاعتِ تعلیم اور

علم پھیلانا درحقیقت نیکی اور ثواب کا کام ہے اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ جہاد کا کام ہے۔ کیا جہالت اور ظلمت سے جنگ کرنا، تاریکی کو رفع کرنا اور علم کی روشنی پھیلانا جہاد نہیں ہے۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت پست ہے جہاں علم مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور جہاں ابھی لوگوں کو علم کی پوری قدر نہیں ہے ....

لیکن! حضرات، جہالت کی جڑ اس وقت تک نہیں کٹ سکتی جب تک علم کی اشاعت ہماری عورتوں اور لڑکیوں میں نہ ہو وہ ملک اور قوم کبھی تعلیم یافتہ اور شائستہ نہیں ہو سکتی۔ جس کے مرد تو علم حاصل کریں اور عورتیں علم سے بے بہرہ رہیں۔ گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک جسم ایسا ہے جو نصف تو صحیح سالم ہے اور نصف مفلوج؟ بچوں پر ماں باپ دونوں کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ماں کا اثر باپ سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں تو کیا اس کے ساتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاہل اور بے علم ماں کا اثر بچے پر اچھا پڑے گا؟ اگر وہ گودیں جن میں ہماری اولادیں پرورش پاتی ہیں جہاں وہ اخلاق و مذہب کا پہلا سبق سیکھتی ہیں جہاں اول اول ان کا کیرکٹر بنتا ہے۔ علم سے خالی ہیں تو پھر ہم کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ جب ہماری اولادیں اُن گودوں میں سے پرورش پا کر بڑھیں گی تو وہ حقیقی علم اخلاق سے آراستہ ہوں گی؟ ....

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں کتب خانوں نے ہمیشہ بڑا کام کیا ہے اور بڑے بڑے لوگ پیدا کئے ہیں۔ ہندوستان کتب خانوں کے لئے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں کتابوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور بعض بزرگوں اور خاندانوں کا ذخیرہ تو نہایت بیش بہا اور قابل رشک تھا اور اس زمانے میں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کتابوں کی آج کل اِس قدر کثرت ہوتی جاتی ہے کہ ان کا جمع کرنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ایک شخص اپنے مذاق کی کتابیں جمع کر سکتا ہے لیکن ہر فن و علم کی کتب کا جمع کرنا شخصی قدرت سے باہر اور اس لئے ضرور ہے کہ سرکار کی طرف سے یا باہمی کوشش سے جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے جائیں تاکہ طالب علم اطمینانِ خاطر سے اپنی فرصت کے وقت میں کتب کا مطالعہ کر سکیں۔ اور جنھیں خدا نے علمی ذوق اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ وہ جدید تحقیقات کا ڈول ڈالیں۔ اور اپنے ملک کے علم میں اضافہ کریں۔ اور جو لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہیں۔ انھیں بھی موقع ملے گا۔ اور ترغیب ہوگی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ کتب سے سچی خوشی اور فیض حاصل کریں۔ ایک اچھا کتب خانہ ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے اشاعت علم میں کتب خانہ مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں بہت سے لوگ جنھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی کتب خانوں کی بدولت بڑے آدمی بن گئے ہیں اور انھوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں کی ہیں۔

....

اگر ہم صاحب جاہ و مال اور صاحب حکومت کی عزت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر ہمیں صاحب علم کی بھی عزت کرنی چاہئیے۔ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور علم کی اشاعت کرتے ہیں وہ ہماری عزت کے بدرجہا مستحق ہیں بہ نسبت

ان لوگوں کے جو مال و دولت کے جمع کرنے میں مصروف ہیں - ایک مدرس خواہ وہ کتنی ہی کم تنخواہ کا کیوں نہ ہو قابل وقعت ہے اس لئے کہ وہ ملک کی بڑی خدمت کر رہا ہے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کا محسن ہے - ہمارا ملک استاد کی عزت کرنے میں ضرب المثل ہے اور ہمارے ہاں استاد کی عزت باپ سے زیادہ کی جاتی تھی - اور بلا شبہ وہ اس کا مستحق ہے دوسرے کم استطاعت اور ہونہار طلبہ کی مدد کرنا ہمارا بڑا فرض ہے - ان ہی کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں اور کیا معلوم کہ ان ہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کے لئے باعث فخر ہوں - ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے ملک کی مدد کرنا ہے ....

جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لئے بھی کریں - ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں ہماری ساری حاجتیں اور ساری امیدیں اپنے ملک سے وابستہ ہیں ملک کی فلاح میں ہماری فلاح اور ملک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے اس لئے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہئے اگر ہم میں اپنے ملک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ان خوفناک آفتوں سے بچنے کے لئے جو جہالت سے پیدا ہوتی ہے خلوص و ایثار جوش و صداقت سے کام لیں - جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں - ایثار و خلوص وہ خوبیاں ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہوگئیں - انھیں کوئی قوت ترقی سے نہیں روک سکتی ....

حضرات! وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور - اس لئے آؤ اب یک زبان و یک دل ہو کر اس مقدس کام کو شروع کریں جس پر ہمارے ملک کی ترقی و اصلاح کا دارومدار ہے اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے ارادوں اور ہمتوں میں برکت دے اور ہم سب کو نیک توفیق عطا کرے - اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پر نور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی صحت و اقبال و عمر میں ترقی عطا فرمائے کیونکہ ان کی کامیابی میں ہماری کامیابی اور ان کی عظمت و اقبال میں ہماری عزت و مسرت ہے - آمین

سر اکبر حیدری

نظم (عثمانیہ یونیورسٹی)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس ۱۳۳۶ھ میں ایک کمسن لڑکے سید آصف الدین احمد طالب علم مدرسہ وسطانیہ گولکنڈہ نے عثمانیہ یونیورسٹی پر ایک نظم سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا، چونکہ یہ جامعہ عثمانیہ پر پہلی نظم ہے اس لئے اس کے چند شعر درج ذیل ہیں :-

میر عثمان علی خاں رحم دل ہیں بادشاہ !　　اس کے عہد معدلت میں خوش ہیں سب شاہ و گداہ

حیدرآباد اور یونیورسٹی کا ہو قیام !　　خوب سمجھیں آپ معمولی نہ تھا یہ کوئی کام

یہ نہ ہوتا - علم دوست ہوتا نہ اپنا بادشاہ　　جانا پڑتا امتحاں دینے ہمیں میلوں کی راہ

اور کیا کیا اس سے آسانی ہوی کچھ بے خبر　　ہوں گے اُردو کی زباں میں جتنے ہیں علم و ہنر

پھر تو کیا آساں ہوگا ہم کو دنیا امتحاں　　کیوں کہ ہر اک فن میں ہوگی مادری اپنی زباں

ملک کو مرہون منت ان کا رہنا چاہیے !　　ان کو اپنا ناخدائے علم کہنا چاہئے !!

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

تیسرا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! اگر میں سنتِ بزرگانِ قوم کی تقلید کروں تو میرا فرض ہوگا کہ میں حامیانِ کانفرنس کے آگے اپنی نااہلی اور بے بضاعتی کا اظہار کرکے معذرت کروں اور ان کی نوازش کا شکریہ دل و جان سے ادا کروں کہ ان کی حسن عقیدت نے مجھ کو آج کے روز کرسیٔ صدارت سے معزز کیا مگر حضرات! آپ تعجب نہ فرمائیں کہ بعوض معذرت و تشکر کے میں خود اس وقت حامیان کانفرنس سے معذرت کا طلبگار ہوں کہ ان حضرات نے کیوں اور کس ضرورت سے ایسے ایک ضعیف مریض بے بصارت اور بے بصیرت شخص کا انتخاب آج کی صدارت کے واسطے کیا جو نہ فقط سرکاری خدمات سے تقریباً نصف صدی کی محنت و مشقت کے بعد وظیفہ پا چکا ہے بلکہ تمام دوسری دنیاوی گفت و شنید و تفکرات سے بلا وظیفہ بطور خود دست کش ہوچکا ہے ....

میری غرض و غایت اس مختصر تقریر سے یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم غلط اصول پر مبنی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود جہاں تک ممکن ہو ان اصول کی اصلاح کردیں اور حکومت کی نظر کو بھی تا بہ حد امکان اس طرف منعطف کریں اس کا طریقہ میرے نزدیک یہ ہوگا کہ اسکولوں میں تمام فنون مثل حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ انگریزی جو ایک اجنبی اور مشکل زبان ہے بطور ایک زبان کے تعلیم دی جائے اور اس کی تکمیل کی طرف بہت زیادہ توجہ کی جائے۔ محض طوطوں کی طرح ریڈروں کے رٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زبان سکھانے کے جدید طریقے اختیار کئے جائیں اور اس کے لئے روزانہ معقول اوقات اور خاص مدرس مقرر کئے جائیں مجھے یقین کامل ہے کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اسکولوں کی تعلیم کی تکمیل میں اس قدر وقت ضائع نہ ہوگا جس قدر اب ضائع ہوتا ہے اور طلبہ کی انگریزی دانی کے معیار میں بھی ترقی ہوجائے گی۔ ذخیرہ لغات انگریزی۔ صحت تلفظ وغیرہ میں بہت کچھ اضافہ ہوجائے گا اس کے علاوہ میری رائے ناقص میں اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو لڑکوں کو موجودہ حالت سے کم تر مدت میں اسکول کی تعلیم سے فراغت ہوجائے گی۔ کالجوں کی تعلیم میں بہت سے چھوٹے بڑے نقائص اب بھی باقی ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً رفتہ رفتہ ہوجائے گی۔ مگر مجھے دو امور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا اس وقت بہت ضرور ہے۔

امر اول یہ ہے کہ گویا کالجوں میں بوساطت زبان انگریزی علوم و فنون کی تعلیم بعض اعتبار سے مفید ہے مگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنے اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی۔ اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ نا آشنا رہیں گے۔ بلاد یورپ و امریکہ میں یہاں تک کہ مصر میں بھی جو ایک اسلامی ملک ہے علوم کی تحصیل میں کسی اجنبی زبان کی وساطت کی حاجت نہیں ہوتی۔ مصر میں بہت سی علمی کتابوں کا فرنچ اور انگلش زبانوں سے عربی میں

ترجمہ ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے ایک ہم ہند کے مسلمان ہی اس نعمت سے محروم ہیں۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامع علمیہ عثمانیہ کو جس میں خاص اُردو زبان واسطہ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے بحسب امید کامیابی ہوی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالامال ہو جائے گی۔ اور کامیابی کیوں نہ ہوگی جب کہ اس کی سرپرستی خود ہمارے شاہ جم جاہ نے منظور فرمائی ہے اور اس کو اپنے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے

دوسرا امر جس کی طرف کارپردازانِ جامع علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامع کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں اور ہندو طلبہ کے واسطے سنسکرت کے درس تدریس کا بندوبست کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ چار پنج سالہ مدت تعلیم میں زبان انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی تکمیل ہو جائے اگر اساتذہ لائق ہوں اور طریقۂ تعلیم و نصاب کتب درست اختیار کیا جاوے تو مجھے یقین کلی ہے کہ ہمارا منشاء پورا ہو جائے گا۔ اور اگر فقط اُردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے۔ اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو امید اور انکی قوم کو ضرورت ہے......

....

حضرات! میں اپنی لاطائل تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا آپ کی کانفرنس کے مقاصد بہت وسیع اور نہایت مفید ہیں خدا کرے کہ آپ ان مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں اور تمام ملک میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہو جائے۔ اور اہل ملک خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی حالت کی اصلاح کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جائیں سچ تو یہ ہے کہ اگر اس عہد معدلت مہد میں جب کہ ہم پر ایسے ظل اللہ کا سایہ پڑ رہا ہے جو ہمہ تن اور ہر وقت اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی فکر میں مصروف ہیں اور کوئی تجویز کوئی استدعاء کوئی گزارش خصوصاً تعلیمی معاملات کے متعلق جس میں واقعی اور درست طور پر اہل ملک کی بہتری کی امید ہو کبھی رد نہیں ہوتی۔ آپ کی کانفرنس ملک میں تعلیم کا شوق اور اہل ملک میں اپنی اصلاح کا مذاق نہ پیدا کرسکے تو سمجھ لیجئے کہ بجز ہماری شومئ قسمت کے اور کوئی اس کا ذمہ دار نہیں۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ حامیان کانفرنس اور نیز وہ بزرگان قوم جو شاید اتفاقاً کانفرنس میں شریک نہیں ہیں عملی طور پر کام کریں اور فقط فصیح و بلیغ تقریروں پر بھروسہ نہ کریں وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

عماد الملک سید حسین بلگرامی

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدۂ اورنگ آباد میں عبدالغنی خاں صاحب رافت نے ایک طویل نظم سنائی تھی جس کے چند شعر درج ذیل ہیں:۔۔

تمھیں بتائیں عزیزو یہ انجمن کیا ہے — کہ جس پہ ملک کا خورد و بزرگ شیدا ہے

فلاحِ ملک کی بنیاد ہے یہہ کانفرنس — کہ روئداد سے اس کے یہ سب ہویدا ہے

دلیل راہ ترقی یہہ انجمن ہوگی — اسی کی ذات سے یہ بیڑا پار ہونا ہے

گزارشوں کو نصیب اس کی گر ہو سمع قبول — ہزار آفریں، کیا ملک تیرا کہنا ہے

یہی ہیں رافتِ دل خستہ کی تمنائیں! — الٰہی اب تو بھلے دن ہمارے بھی آئیں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

دنیا کے بڑے سے بڑے کاموں کا آغاز عجز و انکسار کے ساتھ ہوا ہے ۔ ان کے بانی اپنے عاجزانہ خلوص اور کمزور سعی کی مدد سے اپنے شروع کئے ہوئے کاموں کو بہت جلد ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچتے دیکھ کر متحیّر رہ جاتے ہیں کہ ان سے اتنے بڑے کام اس قدر جلد کیسے ہو سکے ۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی رسمی بنیاد دارالعلوم کے چند فارغ التحصیل طلبہ کے ہاتھوں سے ماہ جمادی الاول ۱۳۳۲ھ میں رکھی گئی ۔ چنانچہ اس مہینے میں آپ کی ایک مختصر جماعت نے جلسہ کر کے تعلیمی کانفرنس قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اس کا نام حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس رکھا ۔ ان ابتدائی اجلاسوں میں شدّومد کے ساتھ کام کرنے والوں میں مندرجہ ذیل علی الخصوص قابل ذکر ہیں :۔
مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم ۔ مولوی عبدالباسط صاحب ۔ مولوی رضی الدین صاحب کیفیؔ مرحوم ۔ مولوی سید بہاء الدین صاحب شطاری مولوی جمال الدین صاحب مرحوم ۔

اس کے بعد دارالعلوم کے بعض اور نوجوانوں نے رسمی شرکت کی ۔ جن میں سے (میں اپنی ذاتی معلومات کے لحاظ سے کہہ سکتا ہوں کہ) مولوی میر اکبر علی صاحب ۔ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب ۔ مولوی شمس الدین صاحب ۔ مولوی محمد مظہر صاحب ۔ مولوی محمد عبدالسلام صاحب مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔

ظاہر ہے کہ سارے حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس کا کام چلانے کے لئے ایک مشرقی تعلیم کا ادارہ اگرچہ وہ اس وقت ملک میں انتہائی شہرت حاصل کر چکا تھا ، کافی رضاکار اور معاون پیدا نہیں کر سکتا تھا ۔ نوجوان بانیوں نے اپنے دائرہ کو وسعت دی اور ملک کے ہر حصے اور تعلیمی ادارے سے ارکان جمع کئے ۔ باہمی مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے بعد اعلیٰ عہدہ داران تعلیم وغیرہ سے بھی مدد اور ہمدردی حاصل کی گئی اور بالآخر ان کی زبردست سرپرستی میں ۲۷ ، ۲۸ فروردی ۱۳۳۴ف کو بمقام ٹاؤن ہال کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا ۔ اس مشہور جلسہ کی صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے (جو اُس وقت معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی تھے) قبول فرمائی ۔ معتمد کانفرنس مولوی مرتضیٰ صاحب مرحوم تھے ۔ انھوں نے انعقادِ ذیلی مجالس ، فراہمی عام ارکان و تقسیم کار کے ضمن میں جو محنت اٹھائی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس موقع پر ان کا شریکِ کار رہا ہو ۔ جلسہ نہایت شاندار اور کامیاب ثابت ہوا ۔ ملک میں تعلیم کے ساتھ عام دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ علم دوست عہدہ داران سرکار عالی اور دائرۂ ملازمت سے باہر متموّل اشخاص نے محسوس کیا کہ ملک تعلیم میں بمقابل دیگر ممالک و صوبہ جات ہند کے کس قدر پیچھے ہے اور اس نقص کو پبلک کس طرح خلوص نیت کے ساتھ مذہب و ملت کے ظاہری قیود سے اپنے آپ کو آزاد رکھ کر دور کر سکتی ہے ۔ معلّمین و متعلّمین کی بھی ہمت افزائی ہوی اور براہ راست ان کو اس کا انکشاف ہوا کہ

قوم کی ترقی بغیر ان کے باقاعدہ اور منظم اشتراک عمل کے ناممکن ہے ۔
نادار طلبہ کے لئے کانفرنس کی جانب سے وظائف تعلیمی دئے جانے لگے ۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کانفرنس کی اس تعلیمی سرپرستی کو دیکھ کر ملک کے بعض ممتاز سرکاری اداروں نے نہ صرف کانفرنس کے پاس اپنے ہونہار طلبہ کی مالی امداد کی سفارش کی بلکہ اس سے متاثر ہو کر خود بھی سرکار اور دیگر ذرائع سے اپنے طلبہ کے لئے وظائف منظور کرائے ۔ اس کانفرنس میں چونکہ ذمہ دار اشخاص نے اپنے ذاتی تجربہ اور وسیع معلومات کی بناء پر بتلایا تھا کہ زبان اردو تعلیم کے جملہ مدارج میں ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے شاید یہہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک اس تاریخی اجلاس کے بعد فطری طور پر بذریعہ زبان اُردو اعلیٰ و فنی تعلیم حاصل کرنے پر ایک بڑی حد تک نہ صرف آمادہ ہوگیا بلکہ اصرار بھی کرنے لگا ۔ گویا جامعۂ عثمانیہ کے مبارک قیام کے لئے راستہ صاف کرنے والی قوتوں کی فہرست میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی ایک اچھی جگہ حاصل ہے کانفرنس کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ اس کی وہ امداد ہے جس کی بدولت ملک کے اکثر غیر معمولی ذہین مگر کم خوش قسمت نوجوان میدان علم میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ سکے ۔ ہندوستان بھر میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کو یہہ عزت نصیب ہوی ہے کہ اس کی مالی اعانت سے ملک اس قدر کم مدت میں ایسے قابل اور صاحب کمال افراد پیدا کر سکا ۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے تمام حضرات اور خصوصاً وہ ممتاز ہستیاں جنھوں نے کانفرنس کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی ریاضت و ذہانت طبعی سے ملک کی بہترین خدمت گزاری کا موقع عطا کیا ۔ اب اپنی مرفہ الحالی اور کمال عروج کے زمانے میں اس ادارہ کا فیاضی و حق شناسی سے ہاتھ بٹائیں گے ۔ ملک کا سب سے بڑا محسن اور مستحق سپاس وہی ہے جو نوجوانانِ ملک کے جسمانی دماغی و ذہنی ارتقاء کی کوشش کرتا ہے ۔

محمد عبد الرحمٰن خاں

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں مرزا غلام مصطفےٰ صاحب رسا سوم تعلقدار اورنگ آباد نے ایک نظم سنائی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :-

مرحبا قوم کی آواز پر آنے والے ہم ترے واسطے آنکھیں ہیں بچھانے والے
ہم اسی شخص کے قائل ہیں جو کچھ کرکے دکھائے نوحۂ قوم تو لاکھوں ہیں سنانے والے
جذبیں کی ہیں زمانے نے ہزاروں لیکن آج تک ہم ہیں وہی اگلے زمانے والے
سونے والوں پہ ہم الزام لگائیں کیونکر! آپ سو جائیں جو سوتوں کے جگانے والے
ہے اگر منزلِ مقصود کو جانا تو اٹھو بیٹھ کر جائیں گے کس طرح سے جانے والے
میر عثمان علی خاں رہیں آباد رسا اپنے مالک کی ہیں ہم خیر منانے والے

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے ملکی قومی اور علمی خدمات

مولوی محمد مرتضیٰ کو انتقال کئے ہوئے آج تیرہ سال ہوتے ہیں، یکم رجب ۱۳۴۴ھ کو ان کی رحلت ہوئی ہے، ہماری نئی نسل جو اَب کالج سے فارغ ہوکر میدانِ عمل میں گام زن ہوئی ہے، یا وہ سپوت جو ہنوز تحصیلِ علم میں مصروف ہیں غالباً اُن کے نام اور کام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے یہاں مرحوم کے بعض کارناموں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ہماری نئی نسل ایک سچے محبِ وطن کے کارناموں سے آگاہ ہوکر ان کے نقشِ قدم کو اپنے لئے چراغِ ہدایت تصور کریں۔

شمالی ہندوستان کی طرح حیدرآباد میں بھی کئی نامور محبانِ وطن جلوہ نما ہوئے ہیں، جن کے کارنامے زندگیٔ جاوید کے مستحق ہیں۔ ملا عبدالقیوم مرحوم، مولوی عبدالقادر مرحوم، ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادیا، مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم، حضرت کیفی، رائے بال مکند، مولوی عبدالسلام مرحوم وغیرہ وہ معزز ہستیاں تھیں جن کے کارنامے فراموش نہیں کئے جاسکتے،

ان ہی محبِ وطن ہستیوں میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کا نام چوٹی پر نظر آتا ہے، مرحوم کے کارنامے تاریخِ دکن میں تابناک رہیں گے نسلیں ان پر فخر کریں گی، زمانہ ان کو مٹا سکے گا اور نہ حوادث اس کو محو کرسکیں گے۔

سطور ذیل سے معلوم ہوگا کہ مرحوم مرتضیٰ نے ملک اور وطن کی کیا خدمت انجام دی ہے قوم [illegible] وطن کی بہبودی کیلئے کیا کام کئے ہیں۔

قلمروِ آصفی میں جامعہ کے قیام کی جد و جہد

قلمروِ آصفی میں توسیع تعلیم اور ایک مستقل یونیورسٹی کی ضرورت کی تحریک کو مرتضیٰ خاندان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے مختلف اوقات میں پیش کیا ہے سب سے پہلے آج سے تقریباً نصف صدی پہلے راقم کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم سابق رجسٹرار بلدہ نے ایک طویل مضمون مخبرِ دکن میں شائع کیا تھا جس میں حیدرآباد کے لئے ایک یونیورسٹی کی تحریک سرکارِ عالی کے سامنے پیش کی تھی، مرحوم نے تفصیل کے ساتھ اعداد و شمار پیش کرکے بتایا تھا کہ سرکارِ عالی سررشتۂ تعلیمات پر کس قدر رقم صرف کررہی ہے اور مزید کس قدر صرفے سے ایک یونیورسٹی قایم ہوسکتی ہے، اور مطلوبہ رقم کی سبیل سرکار کس قدر آسانی سے کرسکتی ہے، اور اس مستقل یونیورسٹی سے کیا کیا فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ اُس وقت یہ تحریک بہت قبل از وقت ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۳۲۲ھ میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم میدانِ عمل میں اُترے، ایک پمفلٹ "روحِ ترقی" کے نام سے شائع کیا، اس سوال کا جواب دیا گیا تھا کہ حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا۔ اس میں تفصیل کے ساتھ تعلیمی پستی کا اظہار کرتے ہوئے ایک جامعہ کی جانب توجہ دلائی تھی، اس کے بعض اقتباس حسبِ ذیل ہیں:—

"نصاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سب سے اہم بحث یہ ہے کہ حیدرآباد کی عام تعلیمی زبان کونسی ہو، انگریزی یا اردو، موجودہ حالت سے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اصلی زبان انگریزی قرار دی گئی ہے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی

معلوم ہوتی ہے کہ مغربی فنون، معاشرت، تمدن کا سیلاب جس زور شور سے بڑھ رہا ہے، اس لحاظ سے بہ تقلید برٹش انڈیا یہی سچی خیرخواہی ہے کہ ابنائے ملک کو اس سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل بنایا جائے۔ یہ خیال اگرچہ بظاہر درست پایا جاتا ہے لیکن سچائی اس کے بالکل خلاف بیان کرتی ہے ....

..... اردو زبان کی رفتار خود اس سفسطہ کو دور کر دیتی ہے، دیکھو یہ زبان جو خاص ملکی دکنی پیداوار ہے کب پھولنے لگی، اسی وقت سے جبکہ سیلاب مغرب کا تموج شروع ہوا، اور جیسے جیسے اس کی موجیں بلند ہوتی جاتی ہیں یہ سرپلی اور خوش آئند صدا بھی قوی بن رہی ہے، ابنائے ملک اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان کو تازہ رکھیں.......... وہ دکن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو کی ضرورت سمجھی اور بندگان عالی کے عہد میمنت عہد میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان بنی....... اسی بناپر اب حیدرآباد اردو کا اصلی مرکز ہوسکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اسی میں منحصر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے، اسی میں شاہ کی اطاعت ہے اور اسی میں ملک کی بہبودی، اردو عام تعلیم کے لئے کافی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے برخلاف بیانات محض بکواس ہیں۔ (صفحہ ۲۵و۲۶)

عام تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اس طرح مرتبط ہونا چاہیئے کہ ایک دن نظام کالج کی جگہ نظام یونیورسٹی قائم ہو جائے، .... آج اگر ہم نظام یونیورسٹی کا نعرہ مارنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی اثر مترتب نہیں ہوسکتا اور اس لئے تابمقدور ایسی تجویزیں کی گئی ہیں جو سہل الحصول کہی جاسکتی ہیں"۔

اس رسالہ "روح ترقی" کے شائع کرنے کے بعد مرحوم مرتضیٰ بالکل خاموش نہیں ہوگئے بلکہ وہ وقت کے منتظر رہے تاآنکہ ۱۳۲۲ءھ میں انھوں نے حیدرآباد میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، اس کے بعض مقاصد حسب ذیل تھے :-

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کیئے جائیں۔

(د) ادنیٰ تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم سے بہ سہولت مرتبط رہنا ترقی کے لئے لازمی ہے، اس لئے اعلیٰ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے، اعلیٰ تعلیم کا ہمارے ہاتھ میں رہنا نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائیگی۔

(ھ) ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے .... کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے۔

مرحوم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم کے ذریعہ بھی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کرتے رہے اور دارالعلوم کو ترقی دے کر جامعہ کے درجہ پر پہنچانے کی کوشش ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی چنانچہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر جو اڈریس نواب سالار جنگ بہادر (ثالث) مدارالمہام وقت کی خدمت میں

پیش کیا گیا تھا اس میں حسب ذیل استدعا بھی کی گئی ہے :۔

"ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے' جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں' ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم کی جائے' یا بالفاظ دیگر یونیورسٹی قائم کی جائے"

اس کے بعد بھی انجمن طلبا قدیم دارالعلوم کے سالانہ جلسوں میں اس تحریک یا استدعا پر سرکار کو متوجہ کرتے رہے' چنانچہ دارالعلوم کے (۶۳) سالہ جلسہ میں حسب ذیل تحریک کی گئی ہے :۔

"حقیقت میں یہ امر تازیانۂ عبرت ہے کہ حیدرآباد' جہاں سب سے پہلے علوم قدیمہ و جدیدہ کے اجتماع کی کوشش دارالعلوم کے ذریعہ ۶۳ سال پیشتر شروع ہوئی' اس طویل عرصہ میں مشہور آفاق دارالعلوم بن جانے کے عوض ایسی حالت میں ہو کہ بالآخر دور دور سے اس کی ترقی کے لئے توجہ دلائی جائے' سال بھر پہلے جسٹس عبدالرحیم صاحب نے پونہ کانفرنس میں مشرقی یونیورسٹی کے لئے حیدرآباد کو توجہ دلائی اور ابھی حال میں ندوہ میں بھی ایک رزولیوشن ہمارے دارالعلوم کی یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا۔ اگرچہ دارالعلوم میں علوم جدیدہ و انگریزی ۶۳ برس پہلے سے شروع تھے اور اسی زمانہ میں اردو میں مغربی علوم و فنون کے تراجم کا کام بھی امیر کبیر شمس الامرا مرحوم کی توجہ سے معتدبہ ترقی پا چکا تھا۔ نیز طرز تعلیم کی اصلاح بھی مولوی عون الدین صاحب مرحوم کی بدولت دارالعلوم میں ایک مدت پیشتر عمل میں آچکی تھی' لیکن یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں۔ بہر کیف اب تاریکی میں اجالا ہونے لگا ہے' دارالعلوم اپنی شایان شان مرتبہ کو پہنچنے کے قریب ہے' جس کے لئے جوبلی کے موقع پر توجہ دلائی گئی تھی' کہ ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے' جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں' ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم ہو جائے یا بالفاظ دیگر جامعہ قائم کی جائے"

ان تمام تفصیلات سے یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ مرحوم کو حیدرآباد میں **جامعہ** قائم ہونے کی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے' بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین یہی تھا کہ حیدرآباد میں ہماری **جامعہ** قائم ہو جائے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام

مرتضیٰ مرحوم کا دوسرا زریں کارنامہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہے' ۱۳۳۲ھ میں مرحوم نے ہمدردان ملک و قوم کی خدمت میں ایک تحریک پیش کی اور اس میں ہماری تعلیمی پستی کا ذکر کرتے ہوئے اپیل کی کہ اس پستی کے دور کرنے کے لئے کمر ہمت چست کی جائے' اپیل کے بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں' جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مرحوم کو ہماری تعلیمی پستی کا کسقدر رنج تھا' اور کس طرح درد بھرے دل سے انھوں نے اپیل کی تھی :۔

"جیسے جیسے بلاد مغرب میں علمی مجالس کے ذریعہ سے باہمی اجتماع و تعاون کا زور بڑھتا گیا اسی نسبت سے ہماری علمی مجالس شخصیت کے بدنصیب قربان گاہ پر ذبح ہوتی گئیں۔ ہمارے علمی ولولے

دن بدن ماند ہوتے گئے، اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے،........آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی بہت سے مولوی فاضل اور یم اے، بی اے نوجوانوں کی شکلیں نظر آ رہی ہیں، اگرچہ ایسے فارغ التحصیل افراد کی تعداد قلمروِ آصفی کی عظیم الشان آبادی کے لحاظ سے جس قدر مختصر ہے وہ خود قابل افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد میں بھی باہم کوئی جہت جامعہ یا رابطہ علمی ایسا قائم نہیں ہے جس سے ملک کی ضرب المثل مردہ دلی دور ہونے اور علمی جذبات کی نشو و نما میں مدد ملے،.........اگر اس تعداد سے کئی چند زیادہ گراجویٹ بھی پیدا ہو جائیں تو اس وقت بھی علمی تازگی جو منشاء تعلیم ہے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی اور علم کا گہوارہ ایسا مہیا نہ ہو جس کے لب جاں بخش اور مسیحا نفسی کے کرشمے، حیات جاودانی کا لطف بخشیں۔ اسی بناء پر حیدرآباد ایجوکیشنل [illegible] کا قیام [illegible] ہے۔"

کانفرنس کے تین مقصد قرار دئیے گئے تھے یعنی :-

۱۔ ایک علمی سوسائٹی کا قیام جو وقتاً فوقتاً عام مجالس تقریروں اور علمی تحریرات کے ذریعہ علمی تازگی پیدا کرے۔

۲۔ قلمروِ آصفی میں اشاعت تعلیم کی کوشش۔

۳۔ اصلاح تعلیم۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب ذیل نظام العمل مقرر کیا گیا تھا :-

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

(ب) حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ مرتب کرانا۔

(ج) نصاب تعلیم کا ایک موزوں و مناسب حال سلسلہ مہیا کرنا۔

(د) ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرنا۔

(ھ) جامعہ کے قیام کی تحریک۔

(و) تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

(ز) تعلیم طب کی طرف توجہ۔

(ح) تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ۔

مرحوم مرتضیٰ اپنی زندگی تک یعنی (۱۲) سال کانفرنس کے آنریری سکریٹری رہے، اس عرصہ میں (۸) سالانہ اجلاس ہوئے، سرکار عالی نے کئی تحریکات کو منظور فرمایا، اکاسی ہزار سات سو اڑسٹھ کی رقم کانفرنس کے فنڈ میں جمع ہوئی باون ہزار چار سو ساٹھ کے وظائف غیر مستطیع طلبہ کو دیئے گئے، اور انتیس ہزار تین سو آٹھ سلاک باقی تھی۔

مرتضیٰ مرحوم کانفرنس کی رقم کی بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ حفاظت کرتے تھے۔ کبھی بلا منظوری ایک حبہ بھی انھوں نے خرچ نہیں کیا۔ وظائف کی ادائی اور اس کی بازیافت وصولی میں ان کو تلخ سے تلخ تجربات ہوئے،

کانفرنس کی ترقی میں قدم قدم پر مراحل اور مشکلات کا ان کو سامنا ہوا، مگر ایک پہاڑ کی طرح انھوں نے تمام مشکلات کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کیا، ہمت اور استقلال سے قدم آگے ہی بڑھاتے رہے، اور ثابت کر دیا کہ ایک درد بھرا سچا دل اور بے ریا کیا نہیں کر سکتا۔

یہ خلاف واقعہ نہیں ہے کہ حیدرآباد کی تعلیمی ہل چل، علمی چہل پہل، علم و فن کے ذوق و شوق کی جو گرم بازاری اب نظر آ رہی ہے اس میں کانفرنس کا بڑا حصہ ہے۔

کانفرنس کے اعلیٰ خدمات کا اعتراف ملک کے دیگر ارباب قلم نے بھی کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں اس کے متعلق جو صراحت کی حسب ذیل ہے:-

"ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارکباد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد میں اردو کی ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملسکتی۔"

انجمن طلبا قدیم دار العلوم مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اپنی مادر تعلیمی (دار العلوم) سے بڑی محبت تھی، دار العلوم کی ترقی کے لئے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے۔ ۱۳۳۲ھ میں انجمن طلبا قدیم دار العلوم کے نام سے ایک انجمن قائم فرمائی تھی اور اپنے انتقال تک وہ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ان کی تمنا تھی کہ دار العلوم ترقی کر کے جامعہ کی صورت اختیار کرلے، اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے سعی پیہم برابر جاری رکھی اور نہایت متعدی کے ساتھ دامے، درمے، قدمے اور قلمے جد و جہد کرتے رہے، بڑی حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی تھی۔

دار العلوم کی جدید تنظیم ہوئی، مدرسین کا جدید اسکیم منظور ہوا، کئی متخرجین دار العلوم کو اعلیٰ خدمات ملے، جامعہ عثمانیہ کے مجلس رفقا میں ان کے لئے جگہ معنون کی گئی، انجمن کی جانب سے کئی علمی اخلاقی کتابیں شائع ہوئیں۔ کئی مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ اصحاب نے انگریزی تعلیم پائی اور ان کے لئے ہائی ٹسٹ کا امتحان قائم ہوا۔

بہرحال انجمن طلبا قدیم دار العلوم نے بھی ملک کی علمی ترقی اور علمی بیداری میں خاص حصہ لیا ہے، انجمن مذکور کے خدمات کے متعلق ڈاکٹر زور کے خیالات قابل ملاحظہ ہیں:-

"کارکنان انجمن اور خاص کر محمد مرتضیٰ مرحوم قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنے قریب قریب جملہ مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ اس حقیقت حال سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں اور ادبی جد و جہد، انہی ارباب ہمت سے وابستہ تھی، انہی کی زندہ دلی سے دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی نہایت خوش اسلوبی اور جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی، اور یہ غالباً حیدرآباد میں اپنی قسم کا پہلا علمی اجتماع تھا۔ انہی کی پے در پے صداؤں اور تحریکات نے جامعہ عثمانیہ اور دار التالیف و تراجم کے قیام میں مدد دی، انہی کی سرگرمیوں نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس جیسے مفید اور اہم ادارے کی بنیاد ڈالی اور انھیں نے حیدرآباد میں سب سے پہلے سلسلۂ تالیف اردو قائم کر کے ملک میں نظیر پیدا کی۔"

(عہد عثمانی میں اردو کی ترقی صفحہ ۴۹)

ذاتی وظائف تعلیمی

یوں تو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن طلبا قدیم کے فنڈ سے وظائف تعلیمی مقرر تھے، مگر ان کی تعداد منظورہ ہوتی تھی، بلا منظوری مجلس منتخبہ وظائف کوئی وظیفہ جاری نہیں کیا جاتا تھا مگر اکثر مرتبہ ضروریات وغیرہ کے مد نظر جب کسی طالب علم کو وظیفہ نہیں مل سکتا یا اس کے تعلیمی ضروریات پورے نہیں ہو سکتے تھے تو مرتضیٰ مرحوم اپنی ذات سے بھی ایسے نادار طلبہ کی خدمت کرتے تھے، ان کی ماہوار کا ایک بڑا حصہ اس قسم کے وظائف میں خرچ ہوتا

مدرسۂ نظامیہ کی تنظیم میں مرحوم کا حصہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اگرچہ مدرسہ نظامیہ سے تعلیمی تعلق نہیں تھا، مگر مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم کے تعلقات کے باعث وہ مدرسہ نظامیہ سے دلچسپی لینے لگے، اس کے بعد چونکہ مدرسہ نظامیہ خالص دینی مدرسہ تھا اسلئے بھی ان کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔

مولانا انوار اللہ مرحوم کے آخر زمانہ میں جو تنظیم مدرسہ نظامیہ کی ہوئی تھی اس میں مرتضیٰ مرحوم کا بڑا حصہ تھا بلکہ تنظیم کا خاکہ بھی مرحوم کا مرتبہ تھا، نواب فضیلت جنگ کے انتقال کے بعد بھی مرحوم مدرسہ نظامیہ کی انتظامی مجلس میں شریک رہے اور اپنے انتقال تک دل سوزی اور انہماک کے ساتھ مدرسہ کے کاموں سے دلچسپی لیتے رہے۔

انجمن معین المسلمین انجمن اشاعت العلوم وغیرہ

مولوی مرتضیٰ کو حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی سے دلچسپی تھی، ان کی دلی تمنا تھی کہ حیدرآباد ترقی کر کے معراج پر پہنچ جائے۔ اس لئے مرحوم ہر اس صدا پر لبیک کہتے تھے جو ملک کی ترقی، خوش حالی سے متعلق ہوتی، اسی بنا پر وہ کئی انجمنوں کے سرگرم رکن تھے اور نہایت جوش و خروش کیساتھ اس انجمن کے عملی کاموں میں حصہ لیا کرتے۔ — اس قسم کے کئی انجمنیں ہیں جن میں سے معین المسلمین (جو بلا سودی قرضہ کی انجمن تھی) اور انجمن اشاعت العلوم قابل ذکر ہیں، جن میں مرتضیٰ مرحوم نے خاص حصہ لیا ہے۔

حجاز ریلوے اور انجمن ہلالِ احمر

ملا عبد القیوم مرحوم نے حجاز ریلوے کی تعمیر کے زمانہ میں چندہ کی اپیل کی تھی، یہ زمانہ مرتضیٰ مرحوم کی تعلیم کا تھا، مگر وہ اس زمانہ میں بھی نہایت سرگرمی سے ملا صاحب موصوف کو مدد دیتے رہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عام جمود کی حالت تھی، قومی کاموں سے بہت کم ہمدردی ہوتی تھی۔ مرحوم نے جس دلچسپی سے اس کام کو انجام دیا تھا اس کا ملا صاحب کو بھی اعتراف تھا — مرتضیٰ مرحوم جب سفر حجاز کو تشریف لے گئے تھے تو اس وقت انھوں نے حجاز ریلوے کے انتظامات وغیرہ کے متعلق کئی عربی مضامین قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کئے تھے۔ مرحوم کے یہ مضامین اسلامی ممالک میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھے گئے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ملا عبد القیوم مرحوم کے فرزند ملا عبد الباسط صاحب نے انجمن ہلال احمر قائم کر کے مجروحین کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کی تھی اور حیدرآباد سے ایک لاکھ سے زیادہ رقم بھیجی گئی تھی، اس وقت بھی مرحوم مرتضیٰ ملا عبد الباسط کے دست و بازو کی حیثیت سے کام کرتے رہے، چنانچہ ملا صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

اوقافِ مذہبی کی حفاظت اور انتظام

مولوی محمد مرتضیٰ اپنے انتقال کے چند سال پہلے مہتمم اوقاف کی خدمت پر مامور کئے گئے تھے، اگرچہ مرحوم نے اس خدمت کے فرایض کو ایک ملازم سرکار کی حیثیت سے انجام دیا ہے، مگر اس امر کا اظہار بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ ان کو مذہبی اوقاف کی تباہی اور غیر متعلق امور میں اس کی آمدنی کے

خرچ کا بڑا ذریعہ تھا۔ وہ نہایت توجہ و انہماک کے ساتھ شب و روز محنت کرتے تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ اوقاف کی آمدنی جائز مصرف میں خرچ ہو اور اس سے ملک و قوم کی بہبودی ہو سکے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی شب و روز کی محنت شاقہ نے ان کی صحت پر بھی اثر کیا تھا۔

مرحوم کی ملازمت کا بڑا حصہ امور مذہبی کے سررشتہ سے رہا وہ متعلقہ کام کے علاوہ سررشتہ کا غیر متعلق کام بھی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔

رسالہ صحیفہ اور اخبار صحیفہ کی قلمی امداد

رسالہ صحیفہ، حیدرآباد کا قدیم ماہوار رسالہ تھا، اس کے مضمون نگاروں کا تقریباً تمام حصہ ملکی اصحاب پر مشتمل تھا۔ اس حیثیت سے یہ رسالہ ملک کا واحد رسالہ تھا۔ اس کے مضامین اعلیٰ اور بلند پایہ ہوتے تھے، ارباب علم و فن، اصحاب ذوق میں اس رسالہ کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ اس کے دلچسپ اور بیش از معلومات مضامین، خاص و عام میں مقبول تھے ـــ اس رسالہ کے اڈیٹر اگرچہ اولاً کیفی مرحوم اور پھر مولانا اکبر علی صاحب تھے۔ مگر مولوی مرتضیٰ بھی اس رسالہ کے روح رواں تھے، ان کے کئی بلند پایہ اور محققانہ مضامین اس میں شائع ہوئے ہیں۔

رسالہ صحیفہ نے زمانہ مابعد میں اخبار کی صورت اختیار کر لی اور آج تک جاری ہے، اس وقت کئی ایک دوسرے اخبار بھی جاری ہیں مگر اس زمانہ میں صرف اخبار صحیفہ ہی ملک و قوم کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، صداقت، راستی، حق پرستی اس اخبار کی امتیازی شان تھی ـــ چونکہ اخبار صحیفہ ملک اور قوم کی زبان تصور کیا جاتا تھا اسلئے مرتضیٰ مرحوم بھی اخبار کی قلمی امداد اور نیک مشورہ سے دریغ نہ کرتے تھے، مولوی اکبر علی صاحب کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ اخبار صحیفہ اور رسالہ صحیفہ مرتضیٰ کا رہین منت ہے۔

تصنیف و تالیف

آخر پر ہم مولوی مرتضیٰ مرحوم کے تصانیف کا ذکر کرتے ہیں، یوں تو مرحوم کے شائع کردہ کتابوں کی تعداد بہت کم ہے، مگر مسودات شائع ہو جائیں تو اہل ملک کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تالیفی حیثیت سے بھی کس قدر بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم، علی گڈھ سے ایک رسالہ "معارف" کے نام سے شائع کرتے تھے، اس زمانہ میں یہ رسالہ اپنے اعلیٰ معیار اور پسندیدہ مضامین کے لحاظ سے اردو زبان کا واحد رسالہ تھا ـــ مرتضیٰ مرحوم اس رسالہ کے خاص مضمون نگار تھے، اور انکے کئی بلند پایہ مضامین اڈیٹر کی تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، یہ زمانہ مرحوم کے طالب علمی کا تھا۔ مرحوم کے اکثر مضامین اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان میں پہلی چیز ہوتی تھی، آپ کے سب مضامین تحقیقات اور انکشافات سے مملو ہوتے تھے، آپکی تاریخ دانی کے مدنظر علامہ شبلی نے آپ سے خواہش کی تھی کہ ان کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کریں ـــ رسالہ صحیفہ کے بھی آپ مضمون نگار تھے، اور آپ کے مضامین خاص اہمیت رکھتے تھے، آپ کے بعض مضامین کی صراحت بے محل نہیں ہو سکتی۔

(۱) تاریخ التاریخ۔ انجمن ترقی اردو نے اس موضوع کی جانب متوجہ کیا تھا، کسی انگریزی داں نے اس پر توجہ نہیں کی، مرتضیٰ مرحوم نے اس عنوان پر ایک مقالہ مرتب کیا اور اخبار وکیل امرتسر نے اس کو شائع کیا ہے۔

(۲) "سسلی میں مسلمانوں کی حکومت" مرتضیٰ مرحوم وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس عنوان پر قلم اٹھایا اور ایک طویل مقالے کے ذریعہ اس پر روشنی ڈالی تھی، چنانچہ مولف تاریخ صقلیہ مولوی ریاست علی ندوی لکھتے ہیں :۔

"اردو میں غالباً سب سے پہلے رسالہ معارف علی گڈھ میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب نے ۱۸۹۹ء میں ایک

سلسلہ مضامین لکھا جو امارتی کے اسی مجموعہ سے ماخوذ تھا' مولوی صاحب مرحوم کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے انہی نے سب سے پہلی مرتبہ اردو میں سسلی کی تاریخ لکھنے کا قصد کیا"۔ ص ۹۔

(۳) "سواحل ہند پر مسلمانوں کا توطن" رسالہ صحیفہ میں یہ مقالہ شائع ہوا تھا۔ اسکے پہلے اردو زبان میں اس عنوان پر کچھ مواد نہیں تھا (۴) سوانح قادر ولی (۵) سوانح باقر آگاہ (۶) سوانح قاضی بدرالدولہ (۷) سوانح سالار جنگ ۔ یہ تمام مضامین رسالہ صحیفہ میں شائع ہوئے ہیں' اور اپنے انکشافی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ (۸) تنقید سفرنامہ ابن جبیر بلحاظ فن تنقید یہ بلند پایہ مضمون ہے۔ (۹) سفرنامہ حجاز' اخبار صحیفہ میں آپ کا یہ سفرنامہ شائع ہوا ہے خاص انداز اور اہم معلومات کا گنجینہ ہے۔ (۱۰) "میلاد خاتم النبیین صلعم" انجمن طلبا رقدیم دارالعلوم نے اس مقالہ کو شائع کیا ہے' رسالت مآب صلعم کی یہ مختصر مگر جامع سوانح عمری ہے ــــ ان کے علاوہ آپ کے بیسیوں مضمون ہیں جو اخبارات مخبر دکن' جریدہ روزگار' نیر آصفی' اخبار صحیفہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں' آپ کے بعض عربی مضمون اخبار العدل قسطنطنیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی تین روئدادیں بھی آپ کی مرتبہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو اہم کتابیں آپ کے زیر تالیف تھیں۔

(۱) "حیات تمدن" یہ خاندان آصفی کی مکمل تاریخ ہے' مرحوم نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ اسکو مرتب کر رہے تھے افسوس ہے کہ اس کا تکملہ نہیں ہوا۔ مرحوم کی زندگی میں اس کا ابتدائی حصہ رسالہ ترقی حیدرآباد میں شائع ہوا اور مرحوم کے بعد "عہد سلف" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے' تاریخ ہند کا بہترین نچوڑ ہے' گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔

(۲) "تفسیر قرآن مجید" سرسید نے جس اصول پر تفسیر قرآں لکھنے کا ارادہ کیا تھا اسی اصول پر آپ تفسیر قلمبند کر رہے تھے وہ یہ بھی مکمل نہ ہوسکی ــــ ان دونوں کتابوں کے علاوہ بعض اور مسودات بھی ہیں جو تاریخ وسوانح وغیرہ پر مشتمل ہیں' یہ سب شائع ہو جائیں تو مرحوم کے تصانیف کی پوری اہمیت واضح ہوسکتی ہے۔

اس تمام تفصیل سے بڑی حد تک مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے قومی خدمات کا حال معلوم ہوسکتا ہے' اس امر کا خیال رہے کہ مرحوم انگریزی کی کوئی ڈگری نہیں رکھتے تھے' وہ دارالعلوم کے "مولوی فاضل" تھے' مذہب کی پابندی کے لحاظ سے وہ پورے "ملا" تھے "مولوی" تھے' مگر وہ پرانے زمانے کے ملا اور مولوی نہیں تھے بلکہ "روشن خیال" زمانہ کی رفتار سے باخبر' سیاسیات ملکی سے واقف تھے' اور ہر امر کے متعلق وہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔

آج سے پندرہ سال قبل ان سے بڑا کوئی قومی لیڈر حیدرآباد میں نہیں تھا۔ وہ جاہ اور مرتبہ سے دور' منکسر المزاج اور متواضع تھے' قومی خدمت سے ان کو عشق تھا۔ وہ صداقت' سچائی' خلوص سے اپنے مفوضہ کام کو انجام دیتے تھے۔

یہ امر کسقدر افسوسناک ہے کہ ان کے بعد انجمن طلبا رقدیم دارالعلوم کا کوئی خبر لینے والا نہیں رہا۔ اور ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی وہ جوش اور خروش باقی نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ کانفرنس سے بہت سارے واقف بھی نہیں فقط

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو خدمات

اس کانفرنس کا خاکہ عمل میں انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم کی تشکیل کے ساتھ ہی بن چکا تھا اور اس کے لئے آج سے قریب قریب پچپیس سال قبل ۱۴؍ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ کو ایک تفصیلی اپیل حامیانِ تعلیم و بہی خواہانِ وطن کی خدمت میں روانہ کی گئی تھی۔ اس اپیل میں کانفرنس کے قیام کی ضرورت اور اس کے مقاصد وغیرہ کی نسبت وضاحت کی گئی تھی اور آخر میں اسکا پروگرام بھی درج تھا۔

کانفرنس کے تین مندرجہ مقاصد کا خلاصہ یہ ہے :۔

(۱) قلمروِ آصفیہ میں کم از کم ایک علمی سوسائٹی تو ایسی ضروری ہے جو اس قلمرو کی جغرافی، تاریخی، ادبی تحقیقات کو وقتاً فوقتاً علمی دنیا کے روبرو پیش کرے، اور باشندگانِ قلمرو میں علمی تحقیقات کا ذوق شوق پیدا کرے۔ اُن کی مادری زبانوں کو علوم و فنون کے سرمایہ سے مالامال کر دے جس کے بغیر یہ طے شدہ ہے کہ کوئی ملک حقیقی ترقی نہیں کر سکتا۔

(۲) اشاعت تعلیم کی کوشش۔ ایک کانفرنس کے ذریعہ سے مختلف شہروں اور قصبوں میں تعلیمی ہل چل اور توسیع دائرۂ تعلیم پیدا کرے۔

(۳) پبلک خود اپنی ضرورتوں پر غور کر کے تعلیم کی اصلاح کرے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے جو پروگرام کانفرنس کے مدنظر قرار دیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

الف۔ اردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم کئے جائیں جن کی قلمروِ آصفیہ میں سخت ضرورت ہے۔

ب۔ حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کے متعلق بکثرت تصانیف اردو میں مرتب کرائے جائیں۔

ج۔ نصابِ تعلیم کا ایک عمدہ سلسلہ خود کانفرنس اُردو میں مہیا کرے گی کیونکہ جب تک ملکی زبان میں تعلیم کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی ترقیٔ ملک کی امید بے سود ہے۔

د۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرائے گی اور کوشش کرے گی کہ اعلیٰ تعلیم خود اپنے ہاتھ میں ہو جو نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائے گی۔

ہ۔ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک

و۔ تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

ز۔ تعلیم طب کی طرف توجہ۔

ح۔ تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ وغیرہ۔

ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کے مقاصد اور پروگرام میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے نہایت غور و خوض کے بعد مفید ترین طریقے پیش کئے گئے۔

اس کانفرنس نے حیدرآباد کی تعلیمی اصلاح و ترقی اور دیگر ضروری امور کے لئے جو کوششیں اور کامیابیاں حاصل کیں ان کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم یہاں اجمالی طور پر کانفرنس کے صرف اُن ہی کارناموں کی طرف اشارہ کریں گے جو حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا باعث ہوئے۔

یوں تو کانفرنس کے جملہ اجلاسوں اور اُن کی کارروائیوں میں اردو زبان ہی استعمال کی گئی یہاں تک کہ مسز سروجنی نائڈو اور پروفیسر ولنکر نے بھی انگریزی کی جگہ اُردو ہی میں تقریریں کیں اور صرف یہی خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اگر کانفرنس اردو پر کوئی اور احسان عظیم نہ بھی کرتی تو اردو کی ترقی اور ذوق کے لئے یہی خدمت کافی تھی کیونکہ اس کانفرنس کے لئے ہر سال جو تحقیقی، تخلیقی اور اصلاحی مقالے اور پرچے لکھے گئے۔ استقبالیہ اور صدارتی خطبے قلمبند ہوئے، مختلف تحریکات وغیرہ کی نسبت تقریریں تیار کی گئیں اور پھر جو سالانہ تفصیلی رپورٹیں مرتب اور بعض شائع بھی ہوئیں، اُن سب کے ذریعہ اردو زبان کے ذخیرۂ ادب اور معلومات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا مگر اس ضمنی خدمت کے علاوہ کانفرنس کے دو چار کارنامے اتنے اہم ہیں کہ حیدرآباد کی موجودہ ترقیِ اردو کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے پہلے سالانہ اجلاسوں ہی سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرانا شروع کیا اس کے جلد سے جلد قائم کرنے کی تحریکیں کیں، ساتھ ہی اُردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت پر زور دیا، اس کے علاوہ اس نے اپنے تقریباً ہر اجلاس میں اُردو کو ملک کا عام ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے قسم قسم کی ترکیبوں سے کام لیا اور آخرکار ثابت کر دکھایا کہ حیدرآباد اگر ترقی کر سکتا ہے تو اُردو ہی میں تعلیم و تعلّم کے ذریعہ سے۔

ایک مشرقی جامعہ کے قیام اور اردو تراجم و تالیف کے انتظام کی نسبت کانفرنس نے جو تحریکیں کیں اُن کا اجمالی تذکرہ یہ ہے:

جامعہ عثمانیہ۔ ۱۳۳۳ھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جو اس وجہ سے نہایت اہم ہے اور تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جامعہ عثمانیہ زیادہ تر اسی کی چہل پہل اور تقریروں کے باعث بہت جلد ظہور میں آسکی۔

اس کانفرنس کی صدارت سر حیدر نواز جنگ بہادر جیسے فرد فرید نے کی جو اس وقت معتمد تعلیمات تھے۔ انھوں نے ملک کے اِس عام رجحان اور شدتِ احساس کو محسوس کرکے اپنے خطبۂ افتتاحیہ ہی میں اس امر کی طرف اشارہ کردیا کہ:-

"خدا نے چاہا تو چند سال میں دار العلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہوجائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۴۴)

صدر کے اس ہمت افزا بیان کے علاوہ دوران کانفرنس میں بعض تقریروں میں بھی اس کی طرف اشارے کئے گئے۔ یعنی پہلی کانفرنس نے یہ ثابت کردیا کہ حیدرآباد تعلیمی ترقی کے لئے تیار ہوچکا ہے اور اب اہل ملک بیدار ہیں۔

ایک سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس اورنگ آباد میں ہوئے اور اس کی صدارت ملک کے فاضل سپوت مولوی شیخ محمد حبیب الدین مرحوم صدر محاسب سرکار عالی نے کی اور انھوں نے قیام جامعہ کی نسبت گذشتہ کانفرنس سے زیادہ مدلل اور ہمت افزا طریقہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ:-

"اس کانفرنس کے اجلاس کا یہ دوسرا سال ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی ترقی تعلیم کے اہم کام کے لئے انتہائی مقصد مرکوز خاطر رکھیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے متفقہ کوششیں کی جائیں۔ ہمارا مقصد اعلیٰ ترقی تعلیم تو ہے لیکن لفظ تعلیم بہت ہی شعبوں پر حاوی ہے۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانویہ، تعلیم ابتدائی، تعلیم نسواں، اخلاق جسمانی، صنعت و حرفت و زراعت وغیرہ کی تعلیم یہ سب شعبے بجائے خود مکمل نہیں ہو سکتے جب تک ممالک محروسہ سرکار عالی میں بلحاظ حالات ملک و مقاصد رعایا برایا ایک جامع العلوم یعنی یونیورسٹی قائم نہ کی جائے۔ کیونکہ جب ہم اپنے ملک کی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں حاکم و محکوم کی جداگانہ قوتیں نہیں ہیں اور ہماری حکومت ہم سے متباین اغراض نہیں رکھتی ہے، اور خوش بختی سے اس ریاست دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب صدیوں کے میل جول سے ممتزج و مرکب ہو گئی ہے، اور یہاں کے روشن دماغ حکمرانوں نے ہمیشہ کشادہ دلی اور فیاضی سے دونوں کی مدارات و دلجوئی ملحوظ رکھی ہے، پس یہ وہ پاک خطہ ہے جہاں جامع العلوم جیسی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام ہر طرح مناسب و موزوں ہے، جو مغربی علوم و فنون کی تعلیم اور اختراعات و ایجادات کے مواقع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ کا مامن اور دلکش مسکن بن سکے اور جس میں مشرق کے مختلف علوم ادبیہ اور دقیق فلسفہ، حکمت اور تصوف اور حیرت انگیز اخلاقی و مذہبی تمدن اور تعجب خیز صنایع و بدایع قدیم کے خزائن فراہم کئے جا سکیں۔

دنیا میں انسانی جواہر معنوی کو کوئی چیز اس جوش سے ظہور میں نہیں لا سکتی، اور علما و فضلائے وقت کا مرکز نہیں بنا سکتی جیسی وہ یونیورسٹی بنا سکتی ہے جس کو ابنائے ملک اپنی سعی، اپنے اہتمام، اپنے ملک کے پیسے، اپنی دماغی محنت، اپنے علوئے ہمت، اپنی حکومت کے ذریعہ قائم کریں اور جس کو وہ اپنی یونیورسٹی کے نام سے پکاریں۔

چنانچہ ہماری ہمسایہ ریاست میسور . . . . . قیام یونیورسٹی پر رجوع ہے جس پر ملک کی اخلاقی و دماغی ترقی کا انحصار ہے۔ میری دلی تمنا اور پرخلوص دعا اپنے ملک کے لئے بھی یہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں ہے جب ہمارے ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ہمارے یہاں کے بھی جامع العلوم کا سنگ بنیاد ہمارے ہر دلعزیز علم پرور بادشاہ ظل اللہ میر عثمان علی خاں بہادر دام اقبالہٗ و ذید اجلالہٗ کے دست مبارک سے رکھا جائے گا۔" (روئداد صفحہ ۳۳-۳۴)

چنانچہ مولوی حبیب الدین مرحوم کی یہ پیشین گوئی اور پرخلوص دعا اور اس کانفرنس کے اکثر مقررین شلاً مسٹر وامن امجند نایک، مولوی اکبر علی، اور مسٹر ونکر کی خواہشیں دو سرے ہی سال پوری ہوئیں، جب کہ اہل ملک کے اس عام رجحان اور اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کی خاص علمی سرپرستیوں سے واقف ہونے کے بعد ایک نبض شناس اور صاحب ذوق ہستی نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے جو اس وقت معتمد تعلیمات تھے اعلیٰ حضرت حکیم السیاست کی خدمت میں ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ء

میں قیام جامعہ کی اجازت کے لیئے عرض داشت پیش کی جس کے ملاحظہ کے بعد اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ :۔
"اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ عرض داشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا۔"

دار الترجمہ۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے پہلے ہی اجلاس میں یہ تحریک کی کہ "اس کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لیئے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ محکمۂ سررشتۂ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ بارہ ہزار بہترین علمی تراجم و تصانیف اُردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لیئے منظور فرمائے جائیں۔" مولوی عبدالحق صاحب نے اس تحریک کو کانفرنس میں پیش کیا اور اُردو کی اہمیت اور ضرورتوں کے اظہار کے بعد اس کی طرف حسب ذیل الفاظ میں توجہ دلائی :۔

"کیا ایک ایسی زبان کو ترقی دینے اور زندہ رکھنے کے لیئے جسے کروڑوں بندگان خدا بولتے ہیں بارہ ہزار سالانہ کچھ زیادہ رقم ہے؟ یہ کچھ بھی نہیں۔ اور اگر آپ اس تجویز کو منظور کریں اور سرکار سے درخواست کریں تو یقین ہے کہ سرکار ہماری التجا کو ضرور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی۔ سرکار نے اس سے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور صرف کثیر سے ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بعض وجوہ سے قائم نہ رہ سکا، شائد وہ قبل از وقت تھا لیکن اب اس کا وقت آ گیا ہے لوگوں میں عام طور سے بیداری پیدا ہو گئی ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور پُرجوش اصحاب اس کام کو کرنے کے لیئے مستعد ہیں۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۷)

اس کی تائید بابو گیا پرشاد نے کی اور آخر کار وہ نہ صرف کانفرنس میں کامیاب ہوئی بلکہ سرکار نے بھی اس کی طرف کافی توجہ کی اور اس سلسلہ میں نصاب کی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجمن ترقی اردو کے تفویض کیا گیا۔

اس ضمن میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ :۔
"کانفرنس سرکار عالی کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اردو میں علمی تراجم و تصانیف کی اشاعت کے لیئے کانفرنس کی تحریک پر توجہ فرمائی۔ کانفرنس نہایت ادب کے ساتھ اس امر پر توجہ دلاتی ہے کہ جو رقم فی الحال سرکار سے بطور امداد ترقی علم دیجاتی ہے اس کا بہت قلیل حصہ اس مقصد یعنے اردو زبان میں تراجم و تصانیف علمی کی اشاعت میں صرف ہوتا ہے جو ضروریات ملک کے لحاظ سے بالکل غیر مکتفی ہے۔ اور اس لیئے مکرر کانفرنس سرکار کی توجہ اس کام کی خاص امداد کے لیئے مبذول کراتی ہے۔"

اس کی تحریک پنڈت کیشوراؤ صاحب نے کی اور تائید حافظ محمد مظہر صاحب نے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے واضح کیا،

"مجلس اصلاح نصاب امتحانات السنہ مشرقیہ نے جن کتابوں کا ترجمہ ہونا تجویز کیا ہے اور جو آئندہ شامل نصاب ہوں گی اُن کے متعلق انجمن ترقی اُردو نے اس مجلس کے ایما پر کام شروع کر دیا ہے اور بہت جلد اس ضرورت کو پورا کر دے گی لیکن اس کی تکمیل کے لئے انجمن کو سرکار سے مزید امداد ملنے کی ضرورت ہے۔"

(روئداد کانفرنس صفحہ ۶۱)

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال جب جامعہ عثمانیہ کی تشکیل ہونے لگی تو ایجوکیشنل کانفرنس کی یہ درخواست بھی منظور ہو گئی اور ۱۳۳۵ھ م ۱۹۱۷ء میں ایک سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کر دیا گیا جس کی نظامت مولوی عبدالحق صاحب کے تفویض کی گئی۔ اس میں پہلے صرف مغربی زبانوں ہی کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام کیا گیا تھا، مگر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے تیسرے اجلاس منعقدہ ماہ صفر ۱۳۳۶ھ میں توجہ دلائی کہ:۔

"اس کانفرنس کی رائے میں سررشتہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے علوم مشرقیہ کے لئے بھی اُن کے اصلی ماخذوں سے اردو میں ترجمہ و تالیف کا انتظام ہونا چاہیے۔"

اس کی تحریک کرتے وقت حافظ محمد مظہر نے کہا کہ:۔

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو اس امر کی اولیت حاصل ہے کہ پہلے پہل رائے عامہ کے سامنے اس نے یہ امر پیش کیا کہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دینا ممکن ہے اور اس کے بعد سے تمام ملک میں اور برٹش انڈیا میں یہ مسئلہ زیر بحث ہو گیا۔ یہ خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ سرکار عالی نے اس اصول کو تسلیم فرما لیا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے۔ اس اصول کو عملی حیثیت میں لانے کے لئے نیز ملک میں علوم و فنون کو ترقی دینے کے لئے پہلے اجلاس کانفرنس میں یہ استدعا بھی پیش کی گئی کہ ترجمہ و تالیف علوم و فنون کے لئے مخصوص سررشتۂ علوم و فنون قائم ہونا ضروری ہے..... ہم سب کو خوش ہونا چاہیئے کہ کانفرنس کی مجوزہ تحریکات میں سب سے پہلے یہ تحریک منظور ہوئی ہے اور حضرت بندگان عالی کے مرحمت شاہانہ سے شاندار اور وسیع پیمانے پر سررشتہ علوم و فنون قائم فرما دیا گیا ہے۔ ہم کو یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ صحیح اصول پر کام کریگا ...... اس سررشتہ کے متعلق جیسا کہ رزولیوشن سرکار عالی شائع شدہ سے واضح ہوتا ہے فی الحال صرف علوم مغربیہ کی تالیف و ترجمہ کا فرض عاید کیا گیا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ یا دوسرے الفاظ میں عربی، فارسی، سنسکرت میں جو علوم و فنون کے ذخیرے ہیں اُن کے اصل ماخذوں سے اُردو میں تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے اضافہ کیا جائے۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۲۰)

کانفرنس کی یہ تحریک بھی ناکام نہ رہی۔ دارالترجمہ میں مشرقی اور خاص کر عربی اور فارسی کتابوں کے تراجم کا بھی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ اس کام کے لئے نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی مرحوم، مولوی عبداللہ عمادی، مولوی ابوالخیر مودودی اور مولوی سید ابراہیم ندوی وغیرہ جیسے عربی و فارسی کے علما کا بھی تقرر کیا گیا۔

پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نے "سائنس اور اس کی تعلیم کی ضرورت پر"

ایک مفید مضمون پڑھا اور اس میں سائنس کی ابتدائی تعلیم کے انتظام پر زور دیتے ہوئے زبانِ اُردو کی ضرورت کی نسبت حسبِ ذیل تجویز پیش کی :-

"اپلائڈ کمسٹری ٹکنیکل الکٹرسٹی سیول اور میکانکل انجنیرنگ کے ابتدائی مدارج کی ہمارے ملک میں ذراسی کوشش سے نہایت عمدہ تعلیم ہوسکتی ہے...... ان سب فنون کی تعلیم نہایت آسانی سے اردو زبان میں ہوسکتی ہے حسب ضرورت کتابوں کے (جو جدید ترین طریقہ پر لکھی گئی ہوں) ترجمے بلاکسی شدید دقت کے تیار ہوسکتے ہیں"۔ (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۲۷)

صنعت وحرفت اور انجنیرنگ کی اُردو تعلیم کے لئے کانفرنس کئی سال تک برابر کوشش کرتی رہی۔ پہلے سال یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں تعلیم صنعت و حرفت پر کافی توجہ کی ضرورت ہے..... انجنیرنگ اسکول کو ترقی دے کر سیول مکانکل الکٹریکل انجنیرنگ کی تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جانا مناسب ہے۔ جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بندوبست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اُردو میں ہونی چاہیئے"۔ اس کے محرک خان محمد یوسف صاحب اور موید حافظ محمد مظہر صاحب تھے۔ موخرالذکر نے صنعت وحرفت کی نسبت نہایت وسیع معلومات کے اظہار کے بعد اردو تعلیم کی نسبت ان الفاظ میں تحریک کی :-

"جو مدارس صنعت وحرفت آئندہ اضلاع میں قائم ہوں اُن میں بھی اُردو کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے کل کے اجلاس میں کانفرنس میں اس امر پر کافی بحث ہوچکی ہے کہ تعلیم اُردو میں دینا کس قدر مفید ہے.... تعلیم اردو میں دینے کے لئے مقدم چیز کتابیں ہیں اور پھر پڑھانے والے...... ایسی کتابیں ہیں جن کا ترجمہ شمس العلما مولوی ذکا راللہ مرحوم نے اردو میں کردیا ہے۔ انجنیری کے متعلق جو کتابیں ہیں وہ رڑکی کالج کا نصاب ہیں۔ رڑکی کالج کے نصاب کے کچھ حصہ کا اُردو ترجمہ خود رڑکی کالج میں سرکاری طور پر ہوا ہے...... دو تین کتابیں البتہ ترجمہ شدہ نہیں ہیں مگر ان کا بلکہ کل رڑکی کالج کے بقیہ حصہ غیر ترجمہ شدہ کا ترجمہ اُردو میں سرکار عالی کے صرف ایک حکم پر ہوجاسکتا ہے۔ رہا پڑھانے والے جب نواب مختارالملک مرحوم کے زمانہ میں ایسے اصحاب ملتے تھے جو اُردو میں تعلیم انجنیرنگ دیا کرتے تھے۔ موجودہ اسٹاف مدرسہ اردو دانوں کا ہے وغیرہ"۔ (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۶۱)

دوسرے سال بھی اس موضوع سے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا گیا جس کی تحریک کرتے ہوئے مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نے فرمایا کہ :-

"یہ رزولیوشن سال گذشتہ ایک حد تک سرکار سے منظور ہوچکا ہے اب صرف اجرائی باقی ہے۔ سال گزشتہ کے رزولیوشن میں یہ بھی تحریک تھی کہ عام فائدہ کی غرض سے اس مدرسہ کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیئے..... اردو میں سائنس اور انجنیری کی تعلیم بالکل ممکن ہے انجنیری سائنس کا ایک شعبہ ہے اور اس میں ریاضی فزکس اور کمسٹری کی ضرورت ہے ان تینوں کی تعلیم اُردو میں ہوسکتی ہے" وغیرہ

سائنس و صنعت و حرفت، اور انجنیری کی اردو تعلیم کے ساتھ کانفرنس نے طب کی اردو تعلیم کی نسبت بھی تحریکیں پیش کیں۔ چنانچہ پہلے سال کی تحریک یہ ہے:۔

"کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچنے کی غرض سے کم از کم اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اُردو میں ہونا مناسب ہے۔"

ڈاکٹر مرزا رضا خاں صاحب نے تحریک کے سلسلہ میں کہا کہ:۔

"مدرسہ طبابت میں فوراً اردو زبان میں تعلیم کا جاری ہونا نہایت ضروری امر ہے اور کم از کم فی الحال سب اسسٹنٹ سرجن کی تعلیم اُردو ہی میں ہونا چاہیئے، جس میں ملک کی بہبودی ہے۔"

(روئداد کانفرنس صفحہ ۲۱۱)

پھر تفصیلی بحث کے بعد کہا کہ:۔

"اردو میں طبی تعلیم ہونے سے لوگ پہلے تو اپنی زبان میں لائق ہوں گے، پھر طبی علم کے سمجھنے کی قدرت بھی حاصل ہوگی۔ اور عام طور پر جو ترقی ہوگی اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی جن کا اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے زندہ نظائر موجود ہیں کہ جن لوگوں نے اردو زبان میں تعلیم پائی وہ کسی طور سے اپنے دوسرے ہم پیشہ ڈاکٹروں سے کم نہیں ہیں۔" (روئداد صفحہ ۲۱۳)

اس رزولیوشن کی مزید تائید محمد مرتضیٰ مرحوم نے کی اور کہا کہ:۔

"عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تعلیم طب کے لئے اردو میں مواد نہیں ہے، لیکن جب ستر سال پہلے ہمارے ملک میں تعلیم اُردو میں دیجاتی تھی اور جب اس تعلیم کی بدولت ایسے مکمل اور اعلیٰ نمونے اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں، جیسے ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر، تو کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی معکوس کر کے ستر سال کے بعد یہ خیال کرنے لگیں کہ ہماری زبان بند ہوگئی۔ زبان دن بدن کھلتی جائے گی یا بند ہوگی؟" (روئداد صفحہ ۲۱۴)

دوسری سالانہ کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ پھر پیش کیا گیا۔ اس کے محرک شیخ محی الدین صاحب اور موئید محمد مرتضیٰ مرحوم نے نہایت معقول اور مدلل تقریریں کیں جن کے اقتباسات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ گذشتہ سال بھر کے عرصہ میں کانفرنس نے اس بارے میں بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا۔ تحریک تھی:۔

"چونکہ علاقہ سرکار عالی میں مشرقی امتحانات کا سلسلہ بھی قایم ہے اس لئے بلحاظ اس سلسلہ کے طلبہ کے سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے ایک جدید شعبہ کا امتحانا کھولا جانا مناسب ہے۔"

اس کو پیش کر کے محرک نے مروجہ خامیوں کے تفصیلی تذکرہ کے بعد کہا کہ:۔

"اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سردست یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انگریزی طبابت کو اردو کا جامہ پہنایا جائے

اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ انگریزی مدرسہ طبابت میں...... ایک جماعت امتحاناً ایسے طلبہ کی جاری کی جائے جو طبابت انگریزی کو بذریعہ زبان اردو حاصل کریں...... انگریزی کتب طبابت کے تراجم کا مہیا کرنا بلاشبہ ایک مشکل کام نظر آتا ہے لیکن جو معلومات کہ اطراف و اکناف ہند سے کانفرنس کے دفتر میں جمع ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بھی قریب قریب حل شدہ ہے۔ صوبۂ پنجاب و صوبۂ متحدہ کے مدرسہ طبیہ انگریزی کے ڈاکٹروں اور طبی افسروں کے جو آراء وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر اس طریقۂ تعلیم کے موافق ہیں مثلاً کل چالیس اصحاب میں سے صرف تین یا چار ایسے ہیں جو اس تعلیم انگریزی طبابت کو بذریعہ زبان اردو نا قابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔ باقی چھتیس لائق ڈاکٹر اس انتظام کی ضرورت اور اہمیت کے صاف طور پر معترف ہیں...... ان ہی تحریرات میں صاف درج ہے کہ پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں انگریزی طبی مدرسہ کی سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم قریب پچاس سال تک بذریعہ اردو رہی ہے اور اردو تراجم اسی لئے موجود بھی ہیں۔"

(روئداد صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

محمد مرتضیٰ معتمد کانفرنس نے بھی اس کی تائید میں نہایت پر جوش تقریر کی۔

یہی تحریک ۱۳۲۶ھ م ۱۳۲۷ف میں پھر پیش کی گئی اور سید محی الدین صاحب سرجن وظیفہ یاب نے طبیبوں اور طب کے مروجہ خطروں اور نقائص کے سلسلہ میں استدعا کی کہ:۔

"ایسی حالت میں ضرور ہے کہ سرکاری طور پر اس کی تعلیم کا اردو میں انتظام کیا جائے جیسے کہ پہلے تھا جس کے عمدہ نتائج مسلم ہیں۔" (روئداد کانفرنس ۱۳۲۷ف صفحہ ۲۲)

ان علوم و فنون کے علاوہ اردو میں حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کے بارے میں بھی کانفرنس نے نہایت مفید تحریک کی اور اس کے محرک مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے بیان کیا کہ:۔

اردو زبان میں جہاں فنون کی کتابیں تصنیف کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہاں تاریخ و جغرافیہ دکن کی تالیف کا بھی انتظام ہو تو نہایت مناسب ہوگا۔ (روئداد کانفرنس صفحہ ۶۰)

اسی طرح تعلیم نسواں کی نسبت بھی تحریک پیش کی گئی کہ وہ زیادہ تر السنہ ملکی کے ذریعہ سے ہونی چاہئے، مولوی سید خورشید علی صاحب نے اس تحریک کو پیش کرکے کہا کہ:۔

عورتوں نے اب تک تعلیم میں جو نمایاں ترقی نہیں کی اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو اپنی زبان میں اچھی کتابیں نصیب نہ ہوئیں۔ (روئداد ۱۳۲۵ف صفحہ ۷۰)

یہ تو اردو زبان کو مختلف علوم و فنون وغیرہ کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے اور اس میں وسعت دینے کی نسبت تجاویز تھیں۔ آخر میں ایک اور تحریک کا ذکر ضروری ہے جو ملک کے اردو ذوق اور معلومات میں اضافہ کے لئے لازمی تھی چنانچہ تیسری سالانہ کانفرنس نے یہ تحریک پیش کی کہ:۔

"اس کانفرنس کی رائے میں کتب خانہ آصفیہ میں ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اردو تصانیف و تراجم سابقہ وحال کوشش کے ساتھ فراہم کئے جائیں۔"

اس کی تحریک مولوی عبدالحق صاحب نے کی اور کتب خانۂ آصفیہ کے مشرقی ذخیرۂ کتب کی ترقی کے سلسلہ میں کہا کہ:۔

"اس کتب خانہ میں سب سے کم ذخیرہ اردو زبان کا ہے۔ اردو زبان کی کتابوں کے متعلق کوئی ذریعۂ دریافت نہیں ہے اور اس وجہ سے بھی بہت بڑی دقت پیش آتی ہے۔ بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو میں لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن گمنامی میں پڑی ہیں' اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اگر سب کتابیں فراہم کی جائیں' اور اس طرح قدیم اردو کی کتابیں فراہم ہوجائیں تو کتب خانہ کی ایک عمدہ شاخ قائم ہوجائے گی۔ ضرورت ہے کہ اردو کتابوں کی ایک فہرست مرتب ہو جس سے معلوم ہوسکے کہ ہر مبحث پر کون کون کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ اگر اس طرح کتابیں ایک جگہ جمع ہوجائیں گی تو یہ بہت آسانی سے ممکن ہوگا کہ ایک شخص جس کو خدا نے کسی خاص فن کی مناسبت اور استعداد عطا کی ہے' صرف اُردو کی کتابیں دیکھ کر تصنیف و تالیف کرسکے۔"

(روئداد صفحہ ۵۷)

ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارک باد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد کی اُردو ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے' اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی اس ساری کامیابی کا سہرا اس کے ارباب حل وعقد کے سر ہے جنھوں نے نہایت خلوص' توجہ' محنت اور جرأت کے ساتھ اس اہم قومی اور اعزازی کام کو انجام دیا۔ اس کی مجلس انتظامی غیر معمولی خوش قسمت رہی کہ نواب سر حیدر نواز جنگ جیسا علم دوست' صاحب دل' اور ہمدرد صدر اس کو مل گیا' اور محمد مرتضیٰ مرحوم اور مولوی سید خورشید علی صاحب جیسے معتمدین۔ ان دونوں کا خلوص' سرگرمی اور ایثار تمام اہل ملک کے لئے لائق تقلید ہے۔

کانفرنس کے سرگرم اراکین میں مولوی اکبر علی صاحب' پروفیسر ولنکر صاحب' مولوی مرزا احمد بیگ صاحب' مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب' مولوی عبدالحق صاحب' حافظ محمد مظہر صاحب' رضی الدین حسن کیفی مرحوم' اسد اللہ صدیقی صاحب' محمد عبدالعلی صاحب' وامن رام چندر نایک صاحب' ملا عبدالباسط صاحب' رائے بالمکند صاحب اور عبداللطیف خاں صاحب وغیرہ کے ناموں کو ملک کی آئندہ نسلیں ان کی قومی ہمدردی اور علمی مستعدی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔

سید محی الدین قادری زور

(نوٹ۔ اس مضمون کے اکثر اجزا میں نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" سے اخذ کئے ہیں۔)

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" ایک طرح پر "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کے سلسلہ میں قائم ہوئی۔ کیونکہ ایک تو اس کے بانی زیادہ تر وہی حضرات تھے، جو انجمن طلبائے قدیم کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھے، دوسرے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام سے متعلق ابتدائی امور پر غور کرنے کے لئے ۱۹۱۴ء ۱۳۲۳ف میں سب سے پہلا جو اجتماع ہوا تھا اُس کی کارروائیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع کے داعی مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے دل میں دارالعلوم کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ لیکن ابتدائی بحث و گفتگو کے بعد اس نوزائیدہ انجمن کی جو ہئیت مرتب ہوئی وہ وسیع تر اپیل کی مالک تھی۔ ملک کے علمی حلقوں میں "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی فوری مقبولیت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ ملک کی عام ضرورت تھی، چنانچہ اس کے انعقاد کے ساتھ ہی ہر طبقے اور نقطۂ خیال کے علما اس میں حصہ لینے اور ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہوگئے۔ خانگی اداروں میں "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی سی وقیع اور سنجیدہ انجمنیں ہندوستان میں کم ہی نظر آئیں گی۔ ایسے صحت بخش اصولوں پر اس نے کام کی ابتدا کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ملک کا اہم ترین غیر سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی۔ اس کی رائیں اور اس کی تحریکات، عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں وقعت رکھتی ہیں۔ اکثر تحریکات کو حکومت نے کشادہ پیشانی کے ساتھ پسند اور منظور کیا۔ کانفرنس کی اس کامیابی میں اس کے ارکین اور خصوصاً اس کے معتمد مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کی والہانہ سعی کو بہت بڑا دخل ہے۔

کانفرنس، اپنی مساعی اور کامیابیوں کو وقفوں وقفوں سے، ملک اور عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے، اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے۔ یہ اجلاس نہ صرف بلدہ، بلکہ اہالیان اضلاع کی خواہش پر، اضلاع میں بھی منعقد ہوتے رہے۔ اب تک اس طرح کے دس اجلاس ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۵ء میں بمقام حیدرآباد (ٹاؤن ہال) منعقد ہوا۔ اس کی صدارت، ملک کے مشہور مصلح تعلیم، نواب حیدر نواز جنگ بہادر (سر اکبر حیدری) نے کی۔ نواب صاحب اس زمانے میں معتمد تعلیم کے اس عہدہ پر فائز تھے۔ اس اولین اجتماع میں کئی مفید مضامین پڑھے گئے، اور کم سے کم دس اہم تحریکیں منظور کی گئیں۔ قیام جامعہ کی تحریک جو اس سے پہلے کئی دفعہ ابھر ابھر کر دب گئی تھی اس دفعہ پھر پیش ہوئی، خود صدر اجلاس نے جو افتتاحیہ خطبہ پڑھا تھا اس میں بھی اس امر پر خاص زور دیا گیا تھا۔ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے، صاحب صدر نے نری مغربی تعلیم کے غیر تشفی بخش نتائج کو نمایاں کیا اور ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر معین رائے کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے۔

"تقریباً ایک صدی کے تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم، ہمارے ملک کے لئے

مفید نہیں ہوسکتی، جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو، اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو، وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی، موجودہ زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے سود مند نہیں ہوسکتی۔ ایک، ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کردیتی ہے۔ دوسری، ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ اس لئے ضرور، اور لابد ہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔"

کانفرنس کے ایک سرگرم کارکن، مولوی محمد مظہر صاحب نے "تعلیم حیدرآباد" پر جو سیر حاصل مضمون پڑھا تھا، اس میں اعلیٰ تعلیم کی پستی کے اسباب میں سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ، ہماری تعلیم کی باگ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"سب سے اہم ..... اور سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایک مکمل اور قطعی نظام العمل یا پروگرام سررشتہ تعلیم کا مرتب ہو۔ جس میں ملکی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا جائے ...... جس طرح برٹش انڈیا کے ہر صوبے کی تعلیمی حالتیں و ضرورتیں باہم مختلف ہیں، اور اس کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ نظام العمل رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح ہماری سلطنت کی تعلیمی حالت اور ضروریات ایسے ہیں جو کسی ایک خاص صوبہ برٹش انڈیا سے مطابقت نہیں رکھتے ...... یہ امر کہ سررشتۂ تعلیم، حیدرآباد کی بنیاد ملک کی ضرورتوں پر رکھی جائے، کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ اس کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جب کہ بتیس[۳۲] سال قبل بصدارت حضرت غفران مکاں، اسی باغ عام میں ایک دارالفنون قائم کرنے کے مسئلہ پر غور و خوض ہوا تھا۔ ہمارے ملک کی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ فی الحال ان متعلموں کی تعلیم جو ابتدائی درجہ پر منتہی ہوجانے والی ہو، ان کی مادری زبان میں دی جائے، اور ساتھ ہی اردو کی تعلیم بھی ان کو دی جائے۔ جن طلبا کا منشا ثانوی تعلیم سے آگے بڑھنے کا نہیں، ان کی تعلیمی پہلی زبان اردو رہنی چاہیئے۔ اور جس قدر تعلیم علوم مثل حساب، ریاضی، تاریخ جغرافیہ، طبعیات وغیرہ ان کو دی جائے، وہ بھی اردو ہی میں رہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی لٹریچر کی تعلیم لازمی ہے۔"[۱]

اسی اجلاس میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے بھی اردو میں علوم و فنون کے تراجم کی شدید ضرورت پر پر مغز تقریر کی، اور حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کی تحریک پیش کی تھی، جس کی پر زور تائید بابو گیا پرشاد وکیل نے کی۔ یہ دونوں تحریکیں جس قدر جلد بار آور ہوئیں، اس سے کانفرنس کی رائے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مستحق طلبہ کو، وظائف کے ذریعہ امداد دینے کی ایک تیسری تحریک پیش ہوئی تھی۔ جس کو کانفرنس نے فوراً منظور کرلیا۔ اور بڑی جانفشانی سے ایک وظیفہ فنڈ نہایت صحت بخش اصول پر قائم کیا۔ اس فنڈ سے غیر مستطیع طلبہ کو تعلیمی وظیفے دیے جاتے ہیں اور آج تک سینکڑوں طلبہ اس امداد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

اس وقت تک کانفرنس نے مختلف اوقات میں دس[۱۰] سالانہ اجلاس کئے۔ جن میں سے تین[۳]، یعنی دوسرا، پانچواں اور چھٹا علی الترتیب اورنگ آباد، لاتور اور پربھنی میں منعقد ہوئے۔ اس سے اضلاع میں اشاعت تعلیم اور تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے کے

---

[۱] روداد "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" اجلاس اول، ۱۹۱۵ء، صفحہ ۱۲۷ و صفحہ ۱۲۹

ایک ضروری مقصد میں کانفرنس کو بڑی کامیابی ہوئی۔

ان سالانہ جلسوں میں حقیقی مفید اور علمی تحریکیں منظور ہوئیں، اور ان کو رو براہ لانے میں کانفرنس نے جو کوششیں کیں۔ اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ممالک محروسہ کی تعلیم کے تقریباً ہر پہلو پر ان جلسوں میں اظہار خیال کئے گئے۔ اور جو تحریکیں منظور ہوئیں، اُن کو آگے بڑھانے میں کانفرنس نے اپنے تمام وسائل سے کام لے کر تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کی فضا کو تعلیمی دلچسپیوں سے روشناس کر دیا.........

.... ہر سال بیسیوں غیر مستطیع طالب علم کانفرنس کے وظیفہ فنڈ سے امداد حاصل کر کے تعلیم جاری رکھنے کے قابل بن رہے ہیں۔

جس وقت کانفرنس قائم ہوئی تھی، ملک میں کوئی عام علمی یا تعلیمی مرکز موجود نہیں تھا۔ اسی لئے بسا اوقات کانفرنس کو، تعلیم کے علاوہ دوسرے علمی، اقتصادی یا سماجی مسائل کو بھی سمیٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن، چند سال سے، ملک کو ایک حیثیت اور خصوصی جماعت یعنے "انجمن اساتذہ حیدرآباد" کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں، جو کارگزاری کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی مفید ترین انجمن ثابت ہو چکی ہے۔ دوسری طرف "انجمن طیلسانیئن عثمانیہ" نے تعلیمی اور علمی معاملات کے علاوہ، سماجی، اقتصادی اور شہری خدمات کو بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے رہی ہے۔ ان انجمنوں کے قیام کے باعث کانفرنس کا بار کچھ ہلکا ہو گیا ہے، پچھلے چند سال سے اس کے اجلاس وقفوں سے منعقد ہو رہے ہیں، اور ان کی کارروائی کی نوعیت بھی زیادہ علمی ہو گئی۔

عبدالقادر سروری

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نیا دور

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک عرصۂ دراز سے نہایت خاموشی کے ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی میں علم کی اشاعت، نادار اور مستحق طلبہ کی مالی امداد اور اُردو زبان کی ترقی کے لیے جو شاندار خدمات انجام دے رہی ہے اس کا تفصیلی حال ان مختلف مضامین میں ملے گا جو ادارۂ ادبیات اُردو نے اس نمبر میں جمع کئے ہیں اگرچہ کانفرنس کے اجلاس کئی سال سے نہ ہو سکے اور عام طور پر اس کے چرچے نہیں رہے لیکن اس کا اساسی کام برابر جاری رہا اور سیکڑوں تشنگانِ علم نے اس کی مالی امداد سے مستفید ہو کر علم سے سیراب ہوئے اور اعلیٰ مدارج علمی حاصل کئے اور کر رہے ہیں اس کا یہ سلسلۂ امداد ابتدا سے لے کر اس وقت تک برابر جاری ہے اور بحمد اللہ اس کی اس خصوصیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سال حال سے کانفرنس کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے سالانہ اجلاسوں کی بنا ڈالی جا رہی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں جس کو کمیٹی بازی یا کانفرنس کا دور کہا جاتا ہے، سالانہ اجلاس یا کانفرنس وغیرہ رسمی چیزیں بن گئی ہیں لیکن جہاں تک ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلق ہے، وہ ایسی رسمی چیزوں سے بالکل مستغنیٰ رہی ہے۔ یہ کانفرنس قوم کی اس خاص سرگرمی سے تعلق رکھتی ہے جس کو فی الحقیقت "قوم ساز سرگرمی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی گزشتہ روایات اور پچھلے تمام اجلاس اس کے پروگرام کو آگے بڑھاتے اور اس کے دائرہ افادہ کو برابر وسیع کرتے رہے ہیں۔ اس کا لائحۂ عمل بالکل تعمیری اور ہر قسم کے تنگ نظرانہ خیالات اور مفادات سے الگ ا... تعلیمی ہے اور جب تک کوئی ملک اور قوم جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں نہیں آئے گی اور تعلیم عام نہ ہوگی کسی قسم کی اصلاح و ترقی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گزشتہ اجلاسوں میں جس مقصد کے حصول کیلئے تحریکات اور قراردادیں منظور کیں تقریریں کرائیں نظمیں لکھائیں اور ہر کہ و مہ کو متوجہ کیا وہ تدریجی طور پر حاصل ہو رہا ہے۔ عہد عثمانی کے فیوض و برکات سے سارے ممالک محروسہ میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ نہ صرف صوبوں اور اضلاع کے مقامات مستقر پر مدرسے قائم ہوگئے ہیں بلکہ وسطانی، تحتانی اور ابتدائی مدارس ملک کے قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ہمارے علم پرور بادشاہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی توجہات شاہانہ سے جامعۂ عثمانیہ سی ملکی اور قومی جامعہ وجود میں آچکی ہے جو گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر اور برطانوی ہند کے تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں کیلئے نمونہ ہے۔ خود رعایائے ملک سرکار عالی میں بیداری اور تعلیم کا شوق عام طور پر پیدا ہو گیا ہے۔ نہ صرف مختلف مقامات پر مدرسوں کے قیام کیلئے آئے دن سرکار کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے بلکہ ابتدائی تعلیم کو جبری اور لازمی بنانے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے اور پبلک نمائندوں کی طرف سے اس کے دو مسودہ ہائے قانون بھی مجلس وضع آئین و قوانین میں پیش ہو چکے ہیں۔ خود سررشتۂ تعلیمات نے بھی ملک کی تعلیمی پیمائش اور ضروریات کو فنی طور پر جانچ پڑتال کر کے ایک مسودۂ قانو

ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے سرکار عالی میں پیش کیا ہے اور اس وقت زیر غور ہے ۔ گزشتہ چند سال سے طلبہ کی تعداد میں اس طرح روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے کہ سرکاری مدارس ہی نہیں بلکہ خانگی اداروں اور امدادی درسگاہوں میں عدم گنجائش سے طلبہ کو داخلہ نہیں مل رہا ہے ۔ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے لئے ہر سال ملک کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد علی گڈھ اور دوسری جامعات میں شریک ہونے پر مجبور ہو رہی ہے ۔

جہاں تک ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا تعلق ہے سررشتہ پوری کوشش اور جد و جہد سے موجودہ مدارس کے استحکام اور نئے مدارس کے قیام میں مصروف ہے ۔ مختلف غیر ضروری مدات میں ہر سال جو کثیر رقم خرچ ہوتی تھی اس کی گنجایش سے اور بعض مدات کی کفایت شعارانہ تنظیم کے ذریعے ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہی بچت نکالی گئی اور اس کو ترقی تعلیم کے ضروری ابواب مثلاً قیام مدارس جدید پر صرف کیا جا رہا ہے ۔ دوپہری طریقہ (شفٹ سسٹم) رائج کرکے مروجہ تعلیم کو زیادہ مستحکم بنانے کے علاوہ مدرسوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ اساتذہ کو کم سے کم خرچ سے تربیت یافتہ بنانے کی کوشش بھی جاری ہے ۔ پیشہ وراثت کے لئے موزوں اور کارآمد اشخاص کا انتخاب کرنے اور اس طرح بالواسطہ نتائج تعلیمی کو بہتر بنانے کے لئے امیدواران سررشتہ کا معائنہ کرکے ان کی صلاحیتوں اور موزونیت وغیرہ کی کافی جانچ کرنے کے بعد ان کو سررشتے میں ملازم رکھا جاتا ہے ۔

خصوصی تعلیم کے مختلف شعبے بھی ارباب تعلیم کی توجہ سے محروم نہیں رہے ۔ پست اقوام کے لئے صحت پرور طریقے پر جو جدید انتظامات کئے گئے ہیں وہ نہایت کامیاب اور حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں ۔ ملک کے ان بدنصیب افراد کی تعلیم کے لئے جو گونگے، بہرے یا اندھے ہونے کی وجہہ سے عام طریقۂ تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتے اور جن کی طرف اس وقت تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ضروری تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ۔ چند اساتذہ کو معذوروں کی تعلیم کے خاص خاص طریقوں کی تحصیل کے لئے کلکتہ بھیجا گیا ہے اور ان کی واپسی کے بعد عنقریب بلدۂ حیدرآباد میں معذوروں کے مدرسے قائم کئے جائیں گے ۔ تعلیم بالغاں کی طرف بھی سرکار عالی متوجہ ہے اور اگرچہ اس کے لئے باضابطہ سرکاری مدارس قائم نہیں ہیں اور نہ اس غرض کے لئے عام مدارس روزینہ کی ضرورت ہے البتہ کافی تعداد میں امدادی مدرسے یا جماعتیں قائم کی گئی ہیں اور پبلک کی بے توجہی کے باوجود اس خصوص میں سرکاری مساعی کا سلسلہ برابر جاری ہے ۔

ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو دور کرکے اس کو علم کی روشنی سے منور کرنے کے لئے سررشتۂ تعلیمات متعدد دشواریوں کے باوجود حسن توجہ اور جوشِ عمل سے کوشاں ہے اور جو تعمیری پروگرام اس کے پیش نظر ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تمام غیر سرکاری اور پبلک اداروں علمی اور تعلیمی انجمنوں، سبھاؤں، دولت مند اور ذی ثروت شہریوں کا اولین فرض ہے کہ دامے درمے قدمے اس مفید کام میں مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور سررشتے کے پیش نظر پروگرام کی تکمیل میں ممکنہ تعاون و اتحاد عمل فرمائیں ۔ خصوصاً ملک کی اس قدیم تعلیمی خدمت گزار انجمن یعنے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے تعاون سے دوسری انجمنوں اور اداروں کے لئے ایک نمونہ

ثابت ہوگی۔ اگر یہ کانفرنس جواب تک نادار اور غیر مستطیع طلبہ کو وظائف تعلیمی دے کر حصول تعلیم میں مدد دیتی رہی ہے اپنا دائرہ عمل وسیع کرکے فی الوقت دو خاص امور اپنے پروگرام میں شریک کرے اور ان کی تکمیل کے لئے ضروری جدوجہد کام میں لائے تو وہ یقیناً ایک ٹھوس اور تعمیری کام انجام دے گی اور اس سے سررشتۂ تعلیمات کے مقاصد کی بھی بہت کچھ پیش رفت ہوگی۔

تعلیم بالغان اور پبلک کتب خانوں کا قیام ملک کی اہم تعلیمی ضروریات میں سے ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے مدنظر اگر ایک عمدہ تنظیم کے ساتھ مدارس شبینہ کے ذریعے ان پڑھ لوگوں کو خواندہ بنانے کی کوشش کی جائے تو اس سے نہ صرف موجودہ جہالت اور ناخواندگی میں معتدبہ کمی ہو جائے گی بلکہ آئندہ نسلوں کی ابتدائی تعلیم کے اچھے مواقع نکل آئیں گے موجودہ ان پڑھ والدین خود خواندہ بن کر اپنے بچوں کو بھی زیور علم سے آراستہ کرنے کے فواید سے آگاہ ہو جائیں گے۔ یہ کام گورنمنٹ سے زیادہ پبلک اور بلدیوں کے فرائض سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس جو قیل وقال اور شور وشغب پر ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتی رہی ہے اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے سکتی ہے۔

دوسری اہم ضرورت پبلک کتب خانوں کے قیام کا ہے۔ بہ حالت موجودہ عام تعلیم اور خصوصاً اضلاع وغیرہ میں جو ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے اس کے ایک حد تک بے اثر اور بے کار ثابت ہونے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ عمداً ایسا ہو رہا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی تعلیم اور ضروری خواندگی کی تحصیل کے بعد مدرسہ ترک کر دیتے ہیں توسیع وترقی علم کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھر رفتہ رفتہ ناخواندہ بن رہے ہیں۔ جہالت کی طرف عود کرنے کی یہ حالت متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے وہاں بھی مختلف تدبیروں کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس تضیع تعلیم اور صحیح معنوں میں علم کی توسیع اور ترقی تعلیم کے لئے پبلک کتب خانوں اور مطالعہ گھروں کا قیام ناگزیر ہے خصوصاً اضلاع میں کتب خانوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ بلدہ حیدرآباد میں بھی ان کی موجودہ تعداد کسی طرح کافی نہیں ہے۔ اگر جگہ جگہ کتب خانے اور مطالعے خانے قائم کئے جائیں اور ان میں عام پسند، سلیس اور مفید معلومات بہم پہنچانے والی کتابیں، اخبار اور رسالے مہیا کئے جائیں تو پبلک میں خود بخود مطالعہ اور تحصیل معلومات کا شوق ترقی کرے گا اور بہت جلد مستحکم علمی ترقی عمل میں آئے گی

رفیق

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اردو کے اسالیب بیان
اردو نثر نگاری کی تاریخ۔ انشاپردازوں کی نثر کے اسلوب اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے

طبع سوم ۲۷۶ صفحات قیمت عہر

اردو شہ پارے
آغاز اردو سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب (نظم و نثر) کا محققانہ تذکرہ معہ نمونۂ کلام۔ قدیم شعراء اور قدردانان اردو کی نایاب تصاویر

بڑی تقطیع ۲۴۰ صفحات مجلد قیمت ہے

روح تنقید
فن تنقید پر اردو ادب کی واحد مستند کتاب جو مختلف جامعات کے نصاب تعلیمی میں شامل ہے

طبع سوم

صفحات ۲۹۰ قیمت عہر

تنقیدی مقالات
روح تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے بہترین ادبی کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں۔

طبع دوم

۲۹۶ صفحات مجلد قیمت ہے

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی
گزشتہ ربع صدی میں اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید اور مکمل تذکرہ جامعۂ عثمانیہ کی مستند تاریخ حیدرآباد کے خدمت گزاران اردو کی خدمات پر تبصرہ

۲۸۶ صفحات مجلد قیمت عہ

محمود غزنوی کی بزم ادب
غزنین کی فارسی شاعری اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ

صفحات ۱۱۷

قیمت عہ

ہندوستانی لسانیات
اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح۔ اپنے فن میں اردو کی پہلی کتاب۔ اردو ہندی جھگڑے کی تاریخ۔

قیمت عال

ہندوستانی صوتیات
(بزبان انگریزی)

اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جدید ترین عملی صوتیاتی آلوں اور گردونوں کے نتائج کے عکس فوٹو۔ قیمت عال

فن انشاپردازی
مضمون نگاری اور انشاپردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے۔ انشاپردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل

صفحات ۱۱۶ قیمت عہ

طلسم تقدیر
زوال گولکنڈہ کے وقت کا نیم تاریخی افسانہ

طبع سوم

صفحات ۶۶

قیمت ۸ر

سیر گولکنڈہ
۱۶ افسانے۔ ۱۲ تصاویر

گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو افسانوں کی شکل میں قطب شاہوں کی مختصر تاریخ

صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۵ر

گولکنڈے کے ہیرے
۱۶ افسانے۔ ۸ تصاویر

سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ گولکنڈہ کے آخری دور کے متعلق نیم تاریخی افسانے

صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲ر

دفتر سب رس۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں۔

مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب

محمد عبدالرحمٰن خاں

اے آر سی ایس - بی ایس سی (لندن) فیلو رائل اسٹرونامکل سوسائٹی صدر ایجوکیشنل کانفرنس

پروپاگنڈے کی دنیا میں کھوٹے کھرے کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کو نام و نمود کی ہوس نہیں وہ پھسڈی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کام کم اور شور زیادہ" زندگی کا اصول بن گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مرعوب کن ناموں کو نظر انداز کرکے صرف ٹھوس کارناموں کا موازنہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنے حقیقی مدارج کی روشنی میں شخصیتیں اُجاگر ہوجاتی ہیں۔ کتنے خاموش خدمت گزار ایسے ہیں جو دنیائے نام و نمود سے ہٹ کر کام کو کام کی خاطر انجام دیتے ہیں؟ ان کے کام غرض سے آلودہ نہیں بلکہ خدمت گزاری ان کا مقصد ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوقِ کار میں ایک مسلسل تڑپ ہے اور ان کی لذتِ کاوش تشنگیٔ دنیا سے تلخ ہونے نہیں پاتی —— بہت کم ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں!

میرے نزدیک کسی کی عظمت کا اندازہ قائم کرنے کا معیار کون ہے؟ "نہیں بلکہ میں" اس نے کیا کیا؟" کی روشنی میں اس کی حقیقی عظمت تلاش کرتا ہوں۔ نام کو پس پردہ رکھ کر کام کا احترام میرا تنقیدی اصول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی کسوٹی پر کھوٹے اور کھرے کی صحیح جانچ ہوسکتی ہے۔

آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں۔ خان صاحب کا نام میں نے سب سے پہلی مرتبہ اُس وقت سنا جب میں فوقانی درجوں میں زیر تعلیم تھا اور ترقی کی امنگیں مجھے جامعہ عثمانیہ کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جب میں نے جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی تو ان کو پہلی مرتبہ دیکھا —— ہندوستان کی یہ بلند پایہ ہستی جس نے مشرق و مغرب سے اپنے ذوقِ علم کے لئے بہت کچھ حاصل کیا اور مشرق اور مغرب کو اپنے علم و فضل سے بہت کچھ دیا، میری نگاہوں کے سامنے تھی —— اس کے بعد وہ ایک سال تک کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر رہے لیکن بدقسمتی سے میں نے اُن سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا۔ اڈکمیٹ میں جامعہ کی منتقلی کے ساتھ ہی وہ وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔

اُن کی علٰحدگی نے طلبائے کلیہ میں ایک الم انگیز ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ کلیہ کے ایک ہر دلعزیز صدر ہیں اور جامعہ کی ترقی بڑی حد تک ان کے پر خلوص مساعی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن جب میں نے طلبہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں سُنیں تو مجھے دکن کے اس مایۂ ناز سپوت کی زندگی سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ان آنسوؤں کا سبب یہی ہے کہ ایک ہمدرد اور دیرینہ محسن بچھڑ گیا؟ —— کیا کوئی اور بھی؟؟ —— اسی تجسس میں جب میں نے ان کے کارناموں کے متعلق معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ یہ ماتم رسمی اور موقتی ماتم نہیں ہے بلکہ انسانی نفسیات سے ہٹ کر اپنے اندر ماضی اور مستقبل کی ایک کشمکش بھی رکھتا ہے۔ ہم سے وہ شخص بچھڑ رہا تھا جس نے ماضی کو تابناک بنایا تھا اور مستقبل کو تابناک تر بنا رہا تھا۔ اور ایسے وقت بچھڑ رہا تھا جب کہ ہم کو اس کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والے یا کام لینے والے مل ہی جاتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کا قحط الرجال ہے جو خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ دوسری خصوصیات سے قطع نظر مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی یہی ایک خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اس سے اُن کے احساسِ خدمت گزاری اور خلوصِ عمل کا بین ثبوت مل جاسکتا ہے۔ ایثار، ہمدردی اور عمل —— یہی تین اوصاف ہیں جو اُن کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

پہلا قدم اور مسلسل جادہ پیمائی۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب اکتوبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ میں ہوئی جب کہ نظام کالج کی صدارت مسٹر سیٹن کے تفویض تھی۔ بارہ برس کی عمر میں امتیاز اولیت کے ساتھ مڈل کامیاب کرکے سرکاری انعام پایا۔ فوقانی تعلیم کے دوران میں پیہم امتیازات حاصل کئے۔ بعض وقت طبیعیات میں ان کو صد فی صد نشانات ملے۔ اس طرح پروفیسر انڈروسن کی شفقت و ستائش کا مرکز بنے رہے۔ میٹرک ۱۹۰۳ء میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں مدراس یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ طیلسان حاصل کیا۔ ان تعلیمی امتیازات کے ساتھ کھیل کے میدانوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت رہی۔ انھوں نے بین المدارس اور بین الکلیاتی مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔

یوں تو ان کی زندگی ہمیشہ طالب علمانہ رہی ہے۔ انھوں نے طلب علم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے۔ وہ دنیائے جستجو میں ہمیشہ گام زن رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی مکتبی زندگی کا پہلو بھی اتنا روشن ہے کہ جس کو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک زندہ اور نصب العینی طالب علم کی حیثیت سے نہ صرف دماغی مشاغل میں اپنے آپ کو مصروف رکھا بلکہ جسمانی تربیت سے بھی غافل نہیں رہے۔

مسلوں کا انبار۔ طیلسان حاصل کرنے کے بعد خاں صاحب یورپی وظیفہ کے مستحق تھے لیکن عمر کی تحدید نے ان کو اپنے اس حق سے محروم رکھا، حالانکہ عماد الملک مرحوم اور پرنسپل سیٹن نے ان کے لئے پرزور سفارش کی تھی۔ تلافی کے طور پر بہت جلد سر جارج کاسن واکر کی کوشش سے محکمۂ فینانس میں ان کی خدمات حاصل کرلی گئیں جہاں وہ کئی ماہ تک کارگزار رہے۔ چونکہ دفتری زندگی کی پیہم مشق میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی تباہی کا اندیشہ تھا اس لئے انھوں نے اسی راستہ کی طرف اپنا رخ کیا جو ان کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا تھا۔ ان کا ہر سانس مسلوں کے انبار سے نکل کر علمی وسعتوں میں لہرانا چاہتا تھا، اس لئے وہ ام اے (ریاضی) کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دفتر کی چار دیواری سے باہر نکل گئے۔

پھر مادرِ علمی کی آغوش میں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کا تقرر نظام کالج کی مددگاری سائنس پر ہوا۔ ڈاکٹر الکمونا تھ کی وظیفہ پر علٰحدگی (اکتوبر ۱۹۰۷ء) سے مسٹر میک ایون کے تقرر (نومبر ۱۹۰۹ء) تک وہ شعبۂ سائنس کے ذمہ دار نگران رہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں وہ مددگار پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے یورپ سے واپس ہوئے تو ان کا تقرر نظام کالج کی پروفیسری پر ہوا۔ اور وہ سب سے پہلے ہندوستانی پروفیسر طبیعیات کی حیثیت سے جس نے نظام کالج کی پروفیسری کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت کیا۔ کام کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی سائنٹفک خدمات سے نہ صرف اس ادارہ کو بلکہ تمام حیدرآباد کو مستفید کیا۔ چنانچہ سائنس کے نئے تجربہ خانے ان ہی کے غور و فکر اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تمام مدارس میں سائنس کی تعلیم کو رواج دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

اس عرصہ میں وہ جامعۂ مدراس کی مجلس رفقاء، مجلس امتحانات، اس سے ملحقہ کلیوں کی کونسل کے رکن اور مجلس ممتحنین کے رکن اور صدر منتخب ہوتے رہے اور اکثر جامعاتِ ہند کی اعلیٰ جماعتوں کے ممتحن مقرر ہوئے۔

اس ملازمت میں انھیں نہ صرف اپنی معلومات سے طلبہ کو مستفید کرنے کا موقع ملا بلکہ ساتھ ساتھ وہ اپنی تشنگی علم بھی بجھاتے رہے اور یہی وہ میدان تھا جس میں ان کو اپنی موزونی طبع اور شوقِ علم کے باعث ترقی کی وسعتیں نظر آئیں۔

مغرب کی دنیا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے اور رائل کالج آف سائنس لندن میں شرکت کی۔ جہاں سے انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب امتیازات کے ساتھ دو ہی سال میں بی ایس سی (آنرز) کی ڈگری حاصل کی اور ریاضی' مساحت' طبیعیات' میکانیات' کیمیا' برق اور انجنیری کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کیں۔ خوش قسمتی سے وہاں انھیں پروفیسر کیلینڈر' آرنبل آرمچے' اسٹرٹ (موجودہ لارڈ ریالے) نے فاولر' ڈبلیو واٹس پیری ماتھر جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرین سائنس کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ جن سے ان کی قابلیت میں اضافہ ہوا۔

بی ایس سی کی تعلیم کے دوران میں وہ وائرلس کے لئے لندن یونیورسٹی کالج میں پروفیسر فلمنگ ایف' آر' ایس کے زیر تعلیم رہے اور ۱۹۱۳ء میں فزیکل سوسائٹی لندن کے رفیق منتخب کئے گئے۔

نیا طور۔ نئی برق تجلی۔ جامعہ عثمانیہ ابھی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس کا کارواں ایک رہنمائی کی تلاش میں تھا اس کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک معمار کی ضرورت تھی جو ان پر ایک قصر تعمیر کرے۔ ایسے نازک وقت میں اس کے انتظام کی باگ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کے سپرد کی گئی۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ نیا تجربہ ہدف اعتراض بنا ہوا تھا لیکن خاں صاحب نے اپنے دورِ صدارت میں اس کو مرکز ستایش بنا دیا۔ استہزا آمیز قہقہوں کی گونج ہوا میں دفن ہو کر رہ گئی اور ہر طرف سے قدر کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں اپنے وطن اور نونہالانِ وطن کا سچا درد ہے اور ان کے تجربوں نے ان میں "یقین محکم" پیدا کر دیا ہے ۔۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ترقی تعلیم' مادری زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں پوشیدہ ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے فرمان مبارک کی تعمیل میں (۱۹۲۱ء) صدارت کا جائزہ لیتے ہی انھوں نے جامعہ کے تمام پہلوؤں کی جانب توجہ کی۔ ملحقہ کالجوں کے قیام سے عثمانین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ موجودہ شعبوں کو ترقی دی گئی اور نئے شعبے کھولے گئے۔ ایک "اسٹاف کلب" قائم کیا گیا جس کی ترقی یافتہ صورت اب بھی "یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے موجود ہے' کیمیا' ریاضی اور طبیعیات کے تجربہ خانوں نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی اور ان کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ہر ایک جامعہ کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حیاتیات اور نباتیات کے دبستانوں کا افتتاح ہوا اور جدید طریقوں پر ان کے تجربہ خانے قائم کئے گئے۔ عمرانیات کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ فلسفہ' اردو' فارسی اور ریاضی کے ام اے اور طبیعیات' کیمیا' نباتیات اور حیاتیات کے ایم ایس سی کی جماعتیں کھولی گئیں۔ ام اے اور ایم ایس سی میں تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی رہنمائی کے لئے اساتذہ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی اور اس کے بعد بھی تحقیقاتی کام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے وظائف جاری کئے گئے۔ جامعہ سے دو بلند پایہ رسالے نکلنے لگے۔ مجلۂ عثمانیہ میں طلبہ اور اساتذہ کے علمی و ادبی مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اور مجلہ تحقیقات علمیہ میں صرف نتائج تحقیق۔

ان طلبہ کے لئے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ممالک جانے کا خیال رکھتے ہوں فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ان میں طلبائے جامعہ کے علاوہ' اساتذہ اور بیرونی اصحاب کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی۔

کتب خانہ کی جدید تنظیم کر کے اس میں جدید ضروریات کے تحت ہزاروں کتابوں کا اضافہ کیا گیا تا کہ اس کا ذخیرہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبہ' اساتذہ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکے۔

ان کے دورِ صدارت میں جامعہ عثمانیہ کھیل کے میدانوں کا بھی مرد رہا۔ کھیل کے موزوں میدانوں کی عدم موجودگی کے باوجود وہ ہر سال پیہم کامیابیاں حاصل کرتا رہا اور مختلف بیرون خانہ اور اندرون خانہ کھیلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔ خصوصاً فٹ بال اور اس کے بعد چند سال تک کرکٹ کا معیار اس قدر بلند ہو گیا تھا، جس کا ردِ عمل آج کل نظر آتا ہے۔

ان کی کوششوں سے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں کئی ذیلی بزمیں قائم ہوئیں جو انجمن اتحاد کے علاوہ اپنے اپنے حلقہ میں علمی خدمات انجام دیتی ہیں۔ کلیہ کی مرکزی انجمن کے علاوہ اقامت خانوں میں بھی انجمنیں قائم تھیں جو معاشری اور علمی مشاغل میں معروف رہتی تھیں۔ ان تمام انجمنوں اور بزموں کے انتخابات موجودہ جمہوری طریقۂ انتخابات کے تحت عمل میں لائے گئے تاکہ طلبہ میں حرکت و حیات پیدا ہو اور وہ تربیت حاصل کر کے مستقبل کی جد و جہد میں کامیابی کے ساتھ حصہ لے سکیں۔

تجربہ بڑھانے کے لئے طلبہ کو ذمہ دارانہ خدمات دی گئیں۔ انجمنوں، اقامت خانوں اور مجلۂ عثمانیہ کے تمام کاروبار اساتذہ کے زیر نگرانی ان کے ہی سپرد کئے گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی سفر کے مواقع بہم پہنچائے گئے کہ بیرون ملک کی تحریکات سے واقفیت حاصل کی جائے۔

وطن سے باہر۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب جب یونیورسٹی کالج لندن کی جوبلی میں شرکت کے لئے لندن گئے تو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے متعلق ایک وسیع پروپگنڈا کیا اور ان کے خلوص و صداقت نے ان گنت دلوں میں جامعہ عثمانیہ کی عزت و احترام کے جذبات پیدا کر دیئے۔ انھوں نے مختلف جامعات یورپ کے ارباب حل و عقد کے سامنے جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی نقطۂ نظر کی وضاحت کی جس کا نتیجہ خوش آئند نکلا۔ ڈاکٹر رضی الدین نے جو اس وقت وہاں موجود تھے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

> "میں بعض ملاقاتوں میں شریک تھا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں کہیں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی جامعہ کی عزت میں اضافہ ہو گیا ـــــ"

اب جب کہ یورپ کی تقریباً تمام جامعات نے رفتہ رفتہ ہماری جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کر لیا ہے ـــ کون نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کی محنتوں کا کافی دخل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی کئی کانفرنسوں اور مجالس میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی اور ہر جگہ اپنی لیاقت اور جامعہ کی افادیت کا سکہ منوایا۔

یہ سب کام انجام نہ پا سکتے اگر؟ داخلی استحکام کے علاوہ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی اپنے وقت کا کافی حصہ صرف کیا۔ وہ مجلس اعلیٰ اور مجلس رفقا کے رکن اور وضع اصطلاحات کی کئی مجالس کے صدر رہ چکے ہیں۔ اور ۱۹۲۸ء میں شعبہ سائنس کے میر شعبہ منتخب کئے گئے۔ غالباً یہ امر اکثروں کے لئے باعثِ تعجب ہوگا کہ انتظامی مشغول کے باوجود انھوں نے تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ایم ایس سی کے طلبہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ چنانچہ وداعی جلسہ کے موقع پر جو طلبائے جامعہ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا سپاس نامہ کے جواب میں کہا:ـــ

> "میں خدا کا بے حد ممنون ہوں کہ اس نے مجھ کو اعلیٰ تعلیم اور ملک کی دیگر اہم خدمات ادا کرنے کے غیر معمولی مواقع عطا فرمائے۔ شاید میں ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکتا، اگر مجھ کو ان کے ساتھ ساتھ ہمت اور عزم اور غیر معمولی صحت جسمانی بھی عطا نہ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ میں باوجود انتظامی کاروبار کے آپ کا

معلم بھی رہا ہوں اور اعلیٰ جماعتوں کے درسوں کی تیاری کا لطف (جس کا صحیح اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے جو تعلیم کا حقیقی معنوں میں دلدادہ ہے) سالہاسال تک اٹھایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کلیہ میں میری صدارت کے زمانے میں اتنے نئے شعبے اور انتہائی تعلیمی جماعتیں کھولی گئیں اور ریسرچ کا مشکل کام جس کا ہمارے پاس سابق میں فقدان تھا نہایت آسانی کے ساتھ انجام پاتا رہا۔ ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ ریسرچ جرنل کی پہلی جلد جب شائع ہوئی ہے تو ارباب تنقید نے اس کا جس خوبی سے خیر مقدم کیا' اس سے جامعہ کا ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کام انجام نہ پاسکتے' اگر میں طلبہ اور اساتذہ کو اپنا ہمنوا اور حقیقی معنوں میں شریک اور ساتھی بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔"

حسن انتخاب۔ مستحق اور قابل طلبہ کے ساتھ خان صاحب کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں۔ ان کی جوہر شناسی کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ انھوں نے جن طلبہ کو یورپی وظائف کے لئے منتخب کیا انھوں نے ملک سے باہر اپنے اعزاز کے ساتھ جامعہ کے اعزاز میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ انھیں جب کبھی موقع ملا تو انھوں نے طلبہ کی رہنمائی کے لئے ایسے صحابہ کا انتخاب کیا جن کے دل میں جامعہ اور اس کے فرزندوں کا درد ہو۔ چنانچہ ان کے عہدِ صدارت میں اکثر عثمانئین کا تقرر جامعہ کے عہدوں پر ہوا اور اس طرح جامعہ کے فرزندوں کے لئے اپنی مادرِ علمی کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ نہ صرف ان عثمانئین کی ہمت افزائی کا باعث ہوا جن کی لیاقت اور قابلیت دوسروں کے لئے رہبری کا کام دے سکتی تھی بلکہ جامعہ کو بھی ایسے لوگ مل گئے جنھوں نے اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور جامعہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہ سر بہ فلک عمارتیں ــــ یہ مینار و گنبد!! کالج کی عمارتیں شہر میں بکھری ہوئی تھیں۔ تعلیمی نظام الاوقات کی پیچیدگیوں کے علاوہ اس کی وجہ سے طلبہ کی برادری میں یک جہتی کا ماحول پیدا کرنے کے لئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ عثمانیہ کا خاص تمدن شہر کے شور و شغب میں اس انداز سے نشو و نما نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنی ایک علٰحدہ صورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب نے جامعہ کے ارباب اقتدار کو بار بار اس کی جانب متوجہ کیا اور نہ صرف لفظی اور تحریری حد تک بلکہ عملی طور پر بھی اس سلسلے میں سعی کی۔ چنانچہ اڈک میٹ میں جامعہ کی منتقلی ان کی متواتر اور پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے جامعہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عارضی بلدالجامعہ کی تعمیر میں اپنے تجربات کی مدد سے قیمتی مشورے دئے اور اس کو اپنی نگرانی میں بسایا ــــ جب تک جامعہ کی سر بہ فلک عمارتوں کے مینار و گنبد پر علم کا پرچم لہراتا رہے گا' ان کے در و دیوار عبدالرحمٰن خاں کے احسانات کا ترانہ خاموشی کے ساتھ الاپتے رہیں گے۔

"لڑکھڑاتی زبان"۔ یہ چند باتیں برسبیل تذکرہ لکھ دی گئی ہیں ورنہ ان کی خدماتِ جامعہ پر ایک مستقل تفصیلی مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ ان کی خدمتیں اتنی محدود نہیں ہیں کہ صرف چند صفحوں پر بیان کر دی جائیں۔ ان کی یہی مخلصانہ خدمات تھیں جن سے متاثر ہو کر "سپاس نامہ" کے ذریعہ طلبائے جامعہ نے "لڑکھڑاتی زبان" سے کہا تھا کہ:-

> "جامعہ عثمانیہ کی تشکیل اور اس کا قیام جامعات ہند میں ایسی اجتہادی کوشش ہے جس کی علم برداری اور قیادت معمولی استعداد کے رہنما سے ممکن نہ تھی۔ پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں ہماری جامعہ نے مختلف ابتدائی دشوار گزار مراحل طے کر کے ہم عصر جامعات میں ایک اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی توسیع و ترقی اور اس کی

نشو و نما میں یوں تو بہت سے حضرات نے حصہ لیا، لیکن صدر کی حیثیت سے آپ نے دس سال کی مدت میں اپنے سچے جذبات اور اعلیٰ احساسات کے ساتھ جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں وہ جامعہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں ۔"

اس امر سے ہر شخص واقف ہے کہ جس وقت جناب والا نے کلیہ جامعہ عثمانیہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کلیہ کی حالت بالکل معمولی تھی، لیکن عالی جناب کی خدمت کا دور شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے اس کے فرزند مختلف محکموں میں طرح طرح کی خدمتیں انجام دینے کے قابل بن گئے۔ اس کے علاوہ ایک سب سے زیادہ خوش گوار اور حوصلہ افزا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کلیہ کے قابل فرزند اپنے اپنے مضامین میں کمال پیدا کرنے کے بعد اسی کلیہ میں معلمی کی کرسیوں پر متمکن ہونے لگے۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی ہمت افزائی عالی جناب کا مستقل نصب العین رہا ۔"

متعلم و معلم کے تعلقات کا مسئلہ نہایت نازک اور اہم ہے۔ اس رشتہ کا حقیقی معنوں میں قائم رکھنا بڑی حکمت عملی اور بلند حوصلگی کا کام ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ادارہ کے نظام کو بلند اور اعلیٰ اصول کے ساتھ قائم رکھنے کی کوشش کے دوران میں ارباب حل و عقد کو متعدد الجھنوں میں پھنس جانا پڑتا ہے، لیکن جناب والا کے حسنِ انتظام نے ثابت کر دیا کہ ایک صاحب رائے اور مدبر انسان، ایک ایسی درس گاہ کو بھی جس میں تقریباً سات آٹھ سو طالب علم تعلیم و تربیت پاتے ہوں، بہ طریقِ احسن چلا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے صحیح نصب العین کو سمجھ لے۔ ایسے اہم کام کو آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، اس کا ثبوت کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ارتقا میں ملتا ہے ۔"

ہمارے کلیہ کی ترقی و توسیع اور اس کے طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور ان کے اخلاق و کردار کی درستی میں جناب والا نے جو کامیاب سعی فرمائی، وہ قابلِ ستایش ہے۔ ہم طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ کسی طرح اس بات کا اعتراف کیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری فلاح و بہبود اور بھلائی کے لئے عالی جناب نے محض ہمارے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی تکلیف اور ایثار سے کبھی دریغ نہیں فرمایا ۔"

طلبائے قدیم کی جانب سے بھی نواب فخر نواز جنگ بہادر نے ان کی اعلیٰ خدمات کا اسی طرح اعتراف کیا، اور اساتذہ صاحبان نے بھی ان کے حسن انتظام کو سراہتے ہوئے ان کی جدائی پر ملال کا اظہار کیا۔ ان تمام کا جواب دیتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے کہا تھا کہ :-

" اگرچہ میرا تعلق اب جامعہ اور علی الخصوص کلیۂ جامعہ عثمانیہ سے منقطع ہو گیا ہے لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جہاں کہیں رہوں گا آپ کا اور جامعہ کا ہی خواہ رہوں گا اور آپ کے ارتقاء کو دیکھ کر خوشی حاصل کروں گا ۔"

یہ ہے ان کا مستحکم کردار ۔ ایک باغبان جس نے اپنے ہاتھوں باغ کو سجایا ہو، دور رہ کر بھی اس سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔

میں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران میں دیکھا ہے کہ وہ جامعہ کی ترقی سے مسرور ہوتے ہیں اور اس کے متعلق جب کبھی کوئی مایوس کن خبر ملتی ہے تو ان کے چہرہ پر بھی مایوسی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

احساسِ پستی کی شکست۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور دوسرے جلسوں میں انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعے سے بار بار اس کا یقین دلایا کہ اردو میں سائنٹفک علوم کی تعلیم بآسانی دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے عملی طور پر بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ ترقیٔ اردو کی تاریخ میں اس بیان کے بغیر ایک کمی رہ جائے گی کہ سائنٹفک علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے اولین علمبرداروں میں مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب بھی ہیں۔ اگر وہ اس احساس پستی کو کہ اردو علمی و فنی علوم کے بار کی حریف نہیں ہوسکتی، دلوں سے نہیں نکال دیتے تو ممکن تھا کہ ایک زمانہ تک ہماری قومی زبان جو اپنی فطرت میں ایک لچک رکھتی ہے، افسانوں اور شاعری کے ذخیروں ہی میں دبی رہتی۔

تخلیقی ادبیات کا دھارا۔ انھوں نے نہ صرف اردو کے علمی اور فنی پہلوؤں کو روشن کیا بلکہ تخلیقی ادب کو ترقی دینے میں بھی کوشش کی۔ چنانچہ عثمانیین میں شاعری، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کا شوق، ان ہی کی حوصلہ افزائیوں اور ذاتی دلچسپیوں کا مرہونِ احسان ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں بزم ڈرامہ ان ہی کی انفرادی کوشش اور بعض دوسرے اہل ذوق اصحاب کے تعاون سے قائم ہوی اور اس بزم کی وجہ سے حیدرآباد میں اردو ڈرامہ نے جو فنی اور ادبی لحاظ سے ترقی کی ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ان کی صدارت کے زمانے میں کئی ایک اردو ڈرامے جامعہ عثمانیہ کے اسٹیج پر کھیلے گئے، اور ان کا اثر رفتہ رفتہ ان ڈرامائی کوششوں کا باعث ہوا جو آج کل وسعت اور امتیاز کے ساتھ جاری ہیں۔

کیا محض یہی؟ ایک بڑے ادارہ کے انتظامی کاروبار کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود انھوں نے تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت نکالا۔ ان کی اکثر تصانیف علمی دنیا میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ انھوں نے نور کی عملی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لئے علم المناظر کا ایک مفید آلہ بھی ایجاد کیا جس کے متعلق "جرنل آف سائنٹفک انسٹرومنٹس لندن" بابتہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تفصیلات شائع ہوئیں اور جس کو میانچسٹر کے مسرس فلاٹرس اور گارنٹ تیار کرتے ہیں۔ ان کے بلند پایہ مضامین ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جامعہ کے لئے انھوں نے طبیعیات کی متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں آواز اور برق کے متعلق ان کی مترجمہ کتابیں اور ضمیمے اپنی جامعیت اور طرز بیان کی وجہ سے اس فن کی بہترین کتابوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ ریاضی سے متعلق بھی ان کی تالیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان سائنٹفک تحریروں کے معیار کے متعلق تو کوئی سائنس داں ہی بہتر رائے دے سکتا ہے، جہاں تک مجھ جیسے ناواقف سائنس کا تعلق ہے میں اس کے صرف ایک پہلو کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرسکتا ہوں اور وہ پہلو ان کا طرز ادا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے سائنس جیسے خالص فنی مضمون کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ ایک عامی بھی اس کی بعض اصطلاحوں سے واقف ہوکر اپنے لئے آسانی سے معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

یوں تو ان کی اکثر تحریریں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں، شائع ہوی ہیں۔ چنانچہ "سب رس" کے کسی گذشتہ شمارہ میں ان کا مضمون "دورِ حاضرہ کے خطرات اور ان سے بچنے کی تدبیریں" نوجوانوں کے لئے ایک قیمتی پیام ہے، لیکن ان کا ڈرامہ

" ضمیمہ" ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے۔ ان کی نظر کی وسعت اور ان کی قدرتِ زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر کس قدر حاوی ہیں۔ " ضمیمہ" کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری کی تنقید " سب رس" کے پہلے شمارہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ان کی یہی غیر معمولی علمی وجاہت ہے جس کے باعث وہ امریکہ کی انجمن محققین شہاب ثاقب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ اور بزم تشہیر سائنس کے رکن اور حیدرآباد کی سائنس ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے اور کئی عظیم الشان جلسوں اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بابتہ ۱۹۲۱ء کی صدارتیں ان کے تفویض کی گئیں۔

اب !! ۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے صدارتِ کلیہ جامعہ عثمانیہ سے سبک دوش ہوتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

"میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ بقیہ عمر علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں صرف کروں، جامعہ کے باہر انفرادی کوشش سے اس قسم کا کام ہونا بہت مشکل ہے لیکن ایک شخص کے لئے جس نے عمر بھر ہر حالت میں طالب علمانہ زندگی بسر کی ہو ایسے طریقہ زندگی کا لطف ہی بالکل نرالا ہے"

چنانچہ وہ ہمیشہ علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی صدارت اور نظام کالج کی پروفیسری کے دوران میں تعلیمی مسائل سے ان کی ذاتی دلچسپی نے کئی تجربے حاصل کئے اور ناممکن تھا کہ ایک ہستی جس کی زندگی دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے عبارت ہو خاموش رہتی۔ چنانچہ وہ اپنے وسیع تجربوں سے مختلف تعلیمی اداروں کو مستفید کر رہے ہیں۔ مدرسۂ آصفیہ، اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد اور مدرسہ اعزہ جیسے ترقی پرور اور کامیاب مدارس ان کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

اس سال وہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں اور کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ ان کی قابلانہ رہنمائی میں یہ کانفرنس جس نے ملک و ملت کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اپنی گذشتہ روایات اور عظمتوں کو پھر حاصل کر لے گی۔

وہی کسوٹی۔ وہی جانچ ۔ ہر چند میں نے اپنی وہ ذمہ داریاں بہ احسن الوجوہ پوری نہیں کیں جو مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کے کارناموں پر قلم اٹھانے سے عائد ہو جاتی ہیں۔ تاہم اجمالی طور پر میں نے ان کی باعمل زندگی اور ان کے قیمتی لمحوں کا ایک تصور پیش کر دیا ہے۔

اب آپ ہی غور کیجیے کہ میں نے جس نام کی حقیقی عظمت اس کے کاموں میں تلاش کی ہے وہ ایک باعظمت ہستی ہے یا نہیں؟ — " نہیں" کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

میکش

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن

سیّد رضی الدّین حسن کیفی

کیفیؔ کی نظمیں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں

سرزمینِ دکن اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے۔ اس کی خاک سے سیکڑوں جگمگاتے تارے طلوع ہوئے جو آسمانِ شاعری پر آفتاب و ماہ تاب بن کر چمکے۔ تحقیقات پوشیدہ سرمایوں پر سے نقاب اُٹھتی جا رہی ہیں اور جیسے جیسے یہ نقاب اٹھتا جا رہا ہے حیرانیوں کے جلو میں نئے نئے انکشافات رونما ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ خیال بھی کہ قدیم دکنی شاعری "گل و بلبل" کے بے سر و پا افسانوں کا ایک طومار ہے دُور ہوتا چلا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدرآباد کا ضخیم دیوان ثبوت دے سکتا ہے کہ آج سے تین سو برس پہلے کا دکنی شاعر بھی فطری شاعری سے غافل نہیں تھا۔ جذبات و احساسات صرف محبت سے متحرک نہیں ہوتے۔ زمانے کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں موضوع بھی بدل گئے ہیں لیکن شاعر کے دل کی دھڑکنیں اب بھی ان ہی احساسات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں جن کا وجود انسانی نفسیات کے باعث ناگزیر ہے۔ مبالغہ اور تصنع سے ہٹ کر صداقتِ شعری جن تخیلات کی تخلیق کرتی ہے وہ کہیں پست ہو کر اور کہیں بلند ہو کر دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کارواں منزل کی طرف

شوریت تھی، شاعر تھے، لیکن شاعری میں ایک جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ تخیلات تغزل اور تصوف میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ مشاہدہ و نظر کی حدیں زندگی سے دُور ہو کر خیالی دنیا میں محصور ہو گئی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد خاں کی حیات آفریں تحریکات نے قومی احساس پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا — اور ناممکن تھا کہ شاعر جس کی اعجاز بیانی بعض وقت "جزو پیغمبری" بن جاتی ہے اس حقیقت حال سے چشم پوشی کرتا۔ اس کی دنیائے ورد نے ایک کروٹ لی۔ چند رندِ بدمست "خیالی شاہد و شراب" کی محفل سے اٹھے اور انھوں نے قدیم پیالوں میں نئی شراب چھلکانی شروع کی۔ اس جرأت رندانہ کے ساتھ اٹھنے والوں میں مولوی حالی سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

دکن میں کیفیؔ کی شاعری کا بول بالا تھا۔ فیض کے اثر، میکش کے تصوف اور داغ کے تغزل اور لطف زبان کے امتزاج سے انھوں نے اپنی شاعری میں ایک خاص رنگ پیدا کر لیا تھا۔ یاسؔ کی وطنیت سے وہ متاثر ہو چکے تھے۔ ایسے وقت حالیؔ اور اکبرؔ کے نغمے ایک پیامِ بیداری لئے ہوئے دکن میں پہنچے۔ اور ولیؔ کے وطن کا یہی آزادوش سپوت تھا جس نے سب سے پہلے ان نغموں میں اپنے ارتعاشِ دل کو جذب کر دیا اور اس طرح دکن کی موجودہ شاعری کا محرک اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

سرسید کی بانگِ درا نے حیدرآباد میں بھی قومی خدمت گزاروں کا ایک کارواں پیدا کر دیا جو جستجوئے منزل میں سرگرمِ سفر ہو گیا۔ اسی کارواں میں کیفیؔ بھی شریک ہو گئے۔ بعض ہمدردانِ ملک کی کوششوں سے جب ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی تو اس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں کیفیؔ کی نظمیں حرکت و حیات کی لہر دوڑا دیتی تھیں اور سننے والے ایک عزمِ عمل کے ساتھ محفل سے اٹھتے تھے۔

شاعر کی آواز درحقیقت دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ پھر کیفیؔ جیسے شاعر کی آواز جس کے جذبات و احساسات کی عظمت ہزاروں دلوں میں پوشیدہ تھی کس طرح بے اثر رہتی؟ چنانچہ دکن کی علمی نشاۃ ثانیہ کی ساری ہنگامہ آرائیوں میں ان کے مترنم نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

تصویر کا تاریک رخ

دار العلوم کی شصت سالہ جوبلی میں جو نواب سالار جنگ بہادر کے زیرِ صدارت منائی گئی تھی کیفیؔ نے ایک طویل لیکن اثر آفریں نظم سنائی۔ اس نظم میں ایک جگہ انھوں نے موجودہ شاعری کے متعلق اپنے تصور کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

جو غزل گو ہیں وہ شہدے ہیں قصائد گو ہیں بھاٹ | مرثیہ گو ہیں شکم پرور، رباعی گو خراب
شاعری کی علتِ غائی ہوئی تفریحِ طبع | اور اب تفریح کے سامان ہیں بے حد حساب
اک زمانہ تھا کہ شاعر صاحبِ تاثیر تھے | آگ پاگ ان سے کوئی ہوتا تھا کوئی آب آب
شاعر اپنے عہد کے لوگوں کی ہے گویا زباں | لوگ جیسے ہوں گے اس کے شعر ہوں گے انتخاب
شاعری کا رنگ بھی بدلا زمانہ کی طرح | زلفِ شب گوں کٹ گئی پھیکا پڑا لعلِ خوش آب
اب جو شاعر رہ گئے ہیں ان کی حالت ہے عجیب | تین میں گنتی رہی، ان کی نہ تیرہ میں حساب
جذبہ و تاثیر و تخیل و تلاشِ فکرِ شعر | خود بخود وہ گم کیوں نہ ہوں جب ہو دماغ و دل خراب

"دل و دماغ" کی اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے شاعروں کو ایک نئے راستے کی طرف گامزن کیا اور اس طرح قومی و ملی شاعری کے ذریعے سے اصلاحِ قوم کی طرف توجہ کی۔

تعلیم کا جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ جلسہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ کو زیرِ صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری منعقد ہوا تو باغِ عامہ کے شاہ ان ہال میں کیفی نے ایک ممتاز مجمع کے روبرو اپنی قومی نظم "تعلیم کا" سنائی۔ عشق و محبت کی داستانیں سنتے سنتے لوگ اکتا گئے تھے اور جب یہ نئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو گویا وہ چونک سے گئے۔

کیفی نے اس نظم میں تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نظم کی ابتدا میں وہ اربابِ ملک کے جمود کا خیال کر کے مایوس نظر آتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں یقین آفرینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

سنو میری سنو، توبہ گناہوں کی خدا شاہد | کہ ہو سکتا ہے جو تم سے کسی سے ہو نہیں سکتا

وہ نمود و نمائش کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے بلکہ کمال کو عظمت کا سبب قرار دیتے ہیں اور اپنی ملت کو کمال حاصل کرنے کے لئے نصیحت کرتے ہیں۔

کمال انسان کو عالم سے کر دیتا ہے مستغنی | خدا کے واسطے اے بھائیو سیکھو کمال اپنا

اس کے بعد وہ علم کا حقیقی تصور پیش کرتے ہیں اور تصور کی وضاحت کے پردے میں وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی مستقبل شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ علم کا نصب العین "ملازمت" کے تنگ دائرہ کا پابند ہو گیا تھا اور حیات کے دوسرے شعبوں کی طرف کوئی رخ کرتا نظر آتا تھا۔ اس طرح اشاعتِ تعلیم کا مفہوم، تعلیم یافتہ بے روزگاری میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کیفی، اس نظم کے ذریعے سے علم کے کردار ساز مقصد کو واضح کرتے ہوئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل کے متعلق کہتے ہیں۔

یہ سب کچھ سچ ہے کیفی کوئی تم سے یہ اگر پوچھے | کہ بچوں کو کہاں کس طرح سے کیوں کر پڑھائیں کیا
جواب ایسے سوالوں کا نہیں ہے بحث سے خالی | اسی کے واسطے قائم ہوئی ہے انجمن اس جا
کہ اہل الرائے و اہلِ علم و فضل و دانش و بینش | اکٹھے ہو کے سوچیں ہم کو کرنا چاہئے کیا کیا؟
اسی دکھن میں کئی دن سے تھے ہمدردانِ تعلیمی | کہ اپنے ملک میں بھی ہو کمالِ علم کا چرچا
خدا کا شکر ہے تجویز اب یہ راس آئی ہے | اسی کا آج یہ جلسہ ہوا ہے منعقد پہلا

غرض اس سے یہ ہے ہم کام کچھ کرنے لگیں ایسے		کہ جن سے ہو ترقی حالتِ موجودہ میں پیدا

جام حیدری

"تعلیم نما" کا اتنا اثر ہوا کہ اربابِ کانفرنس کے غیر معمولی اشتیاق کے پیشِ نظر رائے بالمکند آنجہانی بی اے کی خواہش پر جو اس وقت رکن ہائیکورٹ تھے۔ کیفی کو اس کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ایک فی البدیہہ نظم سنانی پڑی۔ اس نظم کو سر اکبر حیدری کے نام سے معنون کیا گیا جس کے لئے سر اکبر نے کیفی کا تحریری شکریہ ادا کیا۔

پلا وہ جام صہبائے کرامت ریزا سے ساقی		جھلک جس کی ہو مہرستاں قطرہ جس کا ہو دریا

اس رندانہ ابتدا کے بعد وہ نظم کے آخری اشعار میں کانفرنس کے متعلق کہتے ہیں کہ

رہے تا دورِ ثانی آج کا جلسہ نگاہوں میں		جو تجویزیں ہوئی ہیں پاس رکھنا پاس کچھ ان کا

لگا کر اس کا چرکا اپنا ہم مشرب بنا لو تم		جہاں مل جائے کوئی بھی ہو ہندو کیا مسلماں کیا؟

آخری مصرعہ سے ان کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعر کا مذہب تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے' اس لئے اگر کیفی نے "کفر و ایمان" کو ایک ہی "مذہب انسانیت" کے دو مختلف شعبے خیال کئے ہوں تو اس نقطۂ خیال کی وسعت کو کون شک کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ و اس کے علاوہ "ہندو کیا مسلمان کیا؟" میں ایجوکیشنل کانفرنس کا لائحہ عمل بھی پوشیدہ ہے اس لئے کہ یہ کانفرنس بلا تفریق مذہب و ملت کام کرنا چاہتی ہے۔

اس نظم سے کیفی کی روانیٔ طبع کا پتہ بھی چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کس قدر موزوں' ان کی نظر کس قدر وسیع اور ان کی فکر کس قدر بلند تھی!

نانڈیڑ میں صدا

ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے ہی جلسے نے بلدہ میں ایک علمی چہل پہل پیدا کر دی اور اس کی تحریکوں نے بلدہ سے بڑھکر اضلاع کو بھی اپنے آغوش میں لینا شروع کیا۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارا ملک آج سے پچیس برس پیچھے تھا' شہر کے خوابیدہ باشندے' نقل و حمل اور ریل و رسائل کے ذرائع کی وجہ سے خارجی اور داخلی تحریکات سے ایک حد تک واقف ہی رہتے تھے۔ اس لئے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہی وہ انگڑائیاں لینے لگتے تھے لیکن دیہات کے ناواقف باشندوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کانفرنس کا ایک وفد نانڈیڑ گیا اور وہاں اس نے ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں بھی کیفی نے ایک نظم سنائی جس کے ذریعے سے انھوں نے کانفرنس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور ارباب نانڈیڑ کو ترقیٔ تعلیم کی جانب متوجہ کیا۔

وہ ماضی پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

باتوں میں آج تک تو بہت وقت کھو چکے		وہ وقت جا چکا وہ زمانہ گذر چکا

اب وقت آگیا ہے کہ ہمت کریں بلند		ہر طرح اپنے ملک کی خدمت کریں ادا

اس کے بعد تعلیم کے مفاد کی وضاحت کے ساتھ ان محرومیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو تعلیم کے نہ ہونے سے اہل ملک کو نصیب تھیں۔

تعلیم پر ہے دار و مدار ترقیات		تعلیم سے ہے نشو و نمائے گلِ بقا

تعلیم عام ہو تو ترقی نصیب ہو		پھولے پھلے نہالِ طرب' نخلِ مدعا

تعلیم کے نہ ہونے سے ایسے ہوئے تباہ		سرمایۂ سلف بھی تو ہم نے گنوا دیا

صنعت ہی وہ رہی نہ تجارت ہی وہ رہی		ہیں اہلِ ملک جہل سے محتاج یا گدا

آخر میں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے رجحانات کو ظاہر کرتے ہوئے تعاونِ عمل کی اپیل کرتے ہیں۔

تعلیم عام کے لئے جلسے ہیں جا بجا   کی ہے توجہ از سرِ نو اہلِ ملک نے

"از سرِ نو" کہہ کر ماضی کی عظمتوں کی یاد دلائی ہے۔

۱ قائم ہے پایۂ تخت میں تعلیمی انجمن   ہندو بھی ہو تو کیا ہے مسلماں بھی ہو تو کیا
صدر اس کے حیدری ہیں سکٹری ہیں مرتضیٰ   خود دیں گے وہ سروں پہ دلائیں گے کچھ

۲ ناندیڑ میں بھی چاہیئے اک ایسی انجمن   کام آئے گا وہاں بھی یہاں بھی لیا دیا
جو اس کی ہے غرض ہو وہی اس کا مدعا   سب جانتے ہیں نونہالوں کی ہو اس میں ترقی

۳ اب اہلِ ملک حوصلہ مندی دکھائیں گے   سمجھے تم اس کلام کو درویش کی صدا
اپنی مدد خود آپ کریں گے بلا ریا   اے اہلیانِ خطۂ ناندیڑ، دیتے جاؤ

رایت علم

ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ میں جو مولوی شیخ حبیب الدین صاحب مرحوم بی اے صدر محاسب سرکار عالی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا کیفی نے پہلے جلسہ کی طرح ایک پُر جوش نظم سنائی۔ یہ جلسہ اورنگ آباد میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوا تھا اورنگ آباد جیسے شعریت نواز اہم تاریخی مقام پر کیفی کا یہ نغمہ مستقبل کے لئے ماضی کی ایک آوازِ بازگشت تھا۔

اس نظم کی خصوصیت اس کا غیر معمولی جوش ہے۔ الفاظ سے بھی رجائیت کا جذبہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ابتدا کی طرح ان میں قنوطیت نہیں پائی جاتی بلکہ حالات کے نقشے کو بدلتا ہوا دیکھ کر توقع اور یقین نے ناامیدیوں کو ٹھکرا دیا ہے۔

۱ ہم نے کیا ہے رایتِ علم و ہنر بلند   ہے وقتِ شام پست تو وقتِ سحر بلند
آجائے اس کے سامنے پست، ہر بلند   پست و بلند و مہر پہ شاہد ہے آفتاب

۲ ہم کون ہیں ترقیٔ تعلیم ملک خواہ   اب اس میں پست قد ہو کوئی یا ہو سر بلند
ہر فرد قوم قوم ہے کیا خورد کیا بزرگ   آواز جن کی پست ہے جن کی نظر بلند

۳ پستی بھی کام کی ہے بلندی بھی کام کی   تو پست ابتدا کی بھی نکلے خبر بلند
فی الجملہ ہم سلیقے سے جڑ جائیں یک دگر   کب؟ جب کہ پست وقت پہ ہوں وقت پر بلند

وہ حاضرین کی نفسیات کا مطالعہ کر کے اپنی طویل نظم کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک داستان سناتے ہیں اور اسی داستان سے تشبیہ کا بھی کام لیتے ہیں۔

۱ تم نے سنی ہے ایک افیمی کی داستان   کیا بات ہے؟ ہوا ہے یہ کیا شور و شر بلند
نوکر سے اپنے اس نے کہا دیکھ کیا گرا؟   جس سر نگوں کے قصر کے تھے بام و در بلند

۲ پینک میں ایک روز گرا اپنے بام سے   فرماتے ہیں یہ سن کے وہ آقائے سر بلند
نوکر نے عرض کی کہ میاں آپ ہی گرے   آواز ایک دھم سے ہوئی مختصر بلند

۳ "جب ہم گرے تو لائے بڑی سخت چوٹ آئی"   شور و بکا و گریہ ہوا بیشتر بلند

توقع اور یقین کی دنیا میں بھی وہ ایک وقت گھبرا جاتے ہیں اور اس کی وجہ ان کا احساس پستی نہیں بلکہ ان لوگوں کی بے حسی ہے جن کو وہ "بے درد گوش ناشنوا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

بے درد گوش ناشنوا کہتے ہیں "خموش"   کیوں کر ہو کوئی طائر بے بال و پر بلند
بیٹھا ہوا گلا ہے تو فریاد کیا کریں   منشائے درد دل ہے کہ "فریاد کر بلند"
گویا کہ ایک طوطی نقارخانہ ہوں   فریاد میری کون سنے بے ٹھکانہ ہوں

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں

ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اس انجمن کے لوگ   ہوں بہارِ فصل و کمال اس چمن کے لوگ
سرسبز ابرِ علم سے ہو کشورِ نظام   پیدا ہوں جس سے ملک میں ہر ایک فن کے لوگ
یہ خاص کوشش ہے کہ تعلیم عام ہو   جس دن کی آرزو میں ہیں اس انجمن کے لوگ
وہ وقت جلد آئے خدا وہ بھی دن دکھائے   سانچے میں علم و فن کے ڈھلیں سب وطن کے لوگ
کوشش کرو کہ نام کے مانند کام ہو   وہ کام ہو کہ جس سے زمانے میں نام ہو

آخری بند میں اپنے ملک کی عبرت ناک حالت کا نقشہ کھینچ کر اس میں درد کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ اہلِ ملک کے غرورِ ہمہ دانی نے ان کے حوصلوں میں کس قدر خامی پیدا کر دی ہے۔

خوش خوش اسی میں ہیں کہ کچھ آتا نہیں ہمیں   سر میں سمائی ہے سر اہل دول ہیں ہم   ان جھوٹی شیخیوں میں گرفتار خواب ہیں   اپنے دماغ کے لئے وجہ خلل ہیں ہم
اسلامیوں کو حسن ہمہ رنگ زیب ہیں   ہندو سمجھ رہے ہیں کہ اب اجنبی ہیں ہم   کب تک رہے جبیں پہ یہ ٹیکا کلنک کا   دنیا میں کیا برائے شکار اجل ہیں ہم

آخر میں اپنا پیام سناتے ہیں اور اس پیام کے اثر کو عملی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

زندہ دلی کا کچھ تو نمونہ دکھاؤ تم   ثابت کرو کہ صاحب علم و عمل ہیں ہم   دیکھو ہمیں کہ شعلۂ شمع شعور ہیں   رخشانی ستارۂ صبح ازل ہیں ہم

پرچم علم

ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ جلسہ ۱۳۴۶ھ میں جو زیر صدارت نواب عماد الملک مرحوم ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا کیفی نے "پرچم علم" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔ اور اس شان کے ساتھ سنائی۔

پہلے بند میں وہ اہل ملک کی بے حسی کا پُرشکوہ کرتے ہیں۔ لیکن شکوہ میں گزشتہ اثرات کا بھی ایک پہلو ہے۔

آواز ہم نے جیسی کے ناحق بلند کی   چبھتی ہے دل میں چپ بھی دلِ دردمند کی   آہ دلِ شکستہ کہاں گوشِ دل کہاں   تقدیر آزماتے ہیں ٹوٹی کمند کی
سن لیجئے یہ ایک دکھی کی پکار ہے   صورت تو زہر کی ہے حلاوت ہے قند کی   سن لی جو بات آپ نے احسان آپ کا   سن کر کیا عمل بھی تو منت دوچند کی

عام لوگوں سے ہٹ کر ان لوگوں کا حال بھی عجیب ہے جن کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ "خود پسندی" ان کا شعار ہے اور "سستی" ان کا عمل۔

سوچو تو جہل و علم میں اب فرق کیا رہا   غفلت انھوں نے آپ نے سستی پسند کی   بے سود شاعری کی طرح وعظ و پند ہے   دیکھو جسے وہ اپنی جگہ خود پسند ہے

ان میں ایسے لوگوں کا بھی ایک گروہ ہے جن کے سروں میں "لیڈر" بننے کا سودا تو ہے لیکن ان کا جذبۂ عمل خلوص سے ناآشنا۔

ہر ایک اپنے زعم میں لیڈر ہے قوم کا   ہر ایک اپنی رائے میں اہل کمال ہے   پُر زور اختلاف ہے پُر جوش اغراض   دیکھو جو غور سے تو کرسی کا ابال ہے
بس یہ رفارم اور یہی ہے رفاہِ عام   اخلاص ہے حرام رعونت حلال ہے

"خود ساختہ قائدوں" کا یہ خاکہ اس قدر سچا ہے کہ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اس کے بعد ان کو اپنے وطن کے "سب سے بڑے محسن" یعنی اپنے بادشاہ کا خیال آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے احسانات اور عنایتوں کا وہ عزت واحترام کے بے پایاں جذبات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اہل ملک سے پوچھتے ہیں کہ کیا مالک مجازی کی یہ نوازش ہائے پیہم اپنے اندر ایک درس عمل پوشیدہ نہیں رکھتیں؟ اگر احساس احسان مندی، فرائض شناسی میں مدد دے سکے تو وہ کہتے ہیں کہ:۔

کس حال میں ہماری ہے اولاد دیکھئے   تعلیم یافتوں کی بھی تعداد دیکھئے   ہم کس ہوا میں جیتے ہیں اس کو بھی سوچئے   کس طرح عمر ہوتی ہے برباد دیکھئے
سنجیدگی سے دل میں ذرا غور کیجئے   کیسی پڑی ہے ہم پہ یہ افتاد دیکھئے

تین سال کی اس متواتر چیخ پکار کے متعلق جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اسٹیج سے بلند ہو رہی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ:۔

کچھ نظم و نثر کی ہوئی تاثیر یا نہیں؟   کچھ آپ نے بھی سوچی ہے تدبیر یا نہیں؟   اتنے دنوں سے دیکھ رہے ہیں جو آپ ہم   اس خواب کی بھی ہے کوئی تعبیر یا نہیں؟
یہ چیخ اور پکار بھی کچھ کام آئے گی   جاگے گی اہل ملک کی تقدیر یا نہیں؟   کب تک رہیں گے قعر مذلت میں سرنگوں   اٹھیں گے اپنے بل پہ زمیں گیر یا نہیں؟

اس کے بعد وہ ہمت بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مایوسیوں کے باوجود ہمت نہ ہارنا چاہئے۔

جب تک ہے دم میں دم کبھی ہمت نہ ہارنا   ٹوٹے جو کوہ غم تو خوشی سے سہارنا   اے ممبران انجمن اے بانیان خیر   ہم پھر یہی کہیں گے کہ ہمت نہ ہارنا
جب دکھ چکے ہیں پاؤں گزرگاہ سیل میں   جس طرح، جس طریق سے گزرے گزارنا   کیفی ز من شنو سخنے ہست گوش کن   تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن

دامنِ آرزو

اسی سالانہ جلسہ کے دوسرے اجلاس میں سر اکبر حیدری اور نواب عماد الملک کی فرمائش پر انھوں نے پھر نظم سنائی۔ اس نظم میں کیفی نے طلبا کی اقتصادی حالت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں تعلیم بہت گراں خرچ ہوگئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس ایسے شریف لیکن نادار طلبہ کی اعانت کی طرف متوجہ ہوئی جو مالی الجھنوں کے باعث تعلیم کو خاطر خواہ طور پر حاصل نہیں کر سکتے۔ درد اور اثر اس نظم میں جابجا جھلکتا ہے۔ وہ فقیری کے بھیس میں تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں اور خوئے سوال کو برا نہیں سمجھتے اسی کے ساتھ سفارش کہ اس عہد میں با اثر اصحاب سے اپنی گدائی کے لئے سفارش مانگتے ہیں۔

جنابِ حیدری صاحب ہوں یا عماد الملک سفارش اتنی کریں حامیں سے اٹھ کر کہ اس فقیر کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈالیں زبانِ پاک میں اللہ نے دیا ہے اثر

ذرا ادھر بھی نظر پھینکنا بھلا ہوگا صدا فقیر کی گر تم سنو گے کیا ہوگا

دردِ دل

کیفی سے جلنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جو ان کو کسی طرح نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خلوص اور عمل کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹیں رہی ہیں۔ کیفی نے اسی جماعت کی اغیار پرستی سے متاثر ہوکر یہ نظم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے سالانہ جلسہ میں، جو زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شیروانی آنریری سکرٹری آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۲ / ۱۳ ذی حجہ کو منعقد ہوئی تھی، سنائی تھی۔ ان کو عداوتوں کا کوئی خوف نہیں اور نہ ستائش و صلہ کی پروا۔ ان کا کام خود انعام ہے۔ عید قربان کے دنوں میں ایثار و قربانی کا یہ پیکر شانِ استغنا کے ساتھ اپنی نظم سناتا ہے۔

خیمۂ ابر بھی ہے اوٹ میں خورشید بھی ہے — کچھ چکا چوند بھی ہے کچھ ہوسِ دید بھی ہے

یاس کی یاس ہے امید کی امید بھی ہے — کہ چھری تیز بھی ہے تہنیتِ عید بھی ہے

کٹنے والوں کے گلے ہیں کہ ادھر کٹتے ہیں — ننھے بکرے ہیں کہ ٹپتے ہیں جدھر مٹتے ہیں

بھیڑ بکروں کو کیا ذبح تو کیا ظلم کیا — ظلم جو اس کو سمجھتا ہے یہ ہے اس کی خطا

عید کا روز ہے ساقی مرے ساقی ادھر آ — تجھ پہ قربان مری جان پلا جلد پلا

کہ خیالاتِ پریشان چلے آتے ہیں — مرے کھوئے ہوئے اوسان چلے آتے ہیں

بے خودی پردۂ اربابِ خرد ہے ساقی — تیرے میخانے میں خیرات کی مد ہے ساقی

بے نیازانہ ادا کی کوئی حد ہے ساقی — المدد المدد اب وقتِ مدد ہے ساقی

کب تک آخر ہدفِ اہلِ حسد کیفی ہو — نیک ساقی ہو تو کس طرح سے بدکیفی ہو

کیوں حسد مجھ پہ کرے کوئی لیاقت والا — کہ نہیں ہوں میں کوئی دولت و ثروت والا

ہاں مگر بات ہے اتنی کہ ہوں قسمت والا — مرے ساقی نے بنایا ہے مجھے متوالا

بے خودی میں بھی مگر اتنی خبر لگتی ہے — کہ مجھے ایک زمانہ کی نظر لگتی ہے

نہیں معلوم کہ ہے مجھ سے کوئی کیوں بدظن — آج تک میں نے کسی کو نہیں سمجھا دشمن

جانتے ہیں مجھے اک عمر سے اعیانِ دکن — فخر ہے میرے لئے خدمتِ ابنائے وطن

للہ الحمد ملا ہے مجھے کیا خوب وطن — حیدرآباد دکن ہے مرا محبوب وطن

آج تک امن سے چالیس برس اس میں رہا　　بزمِ عشرت میں رہا، علم کی مجلس میں رہا
نہ کھٹک بن کے کبھی دیدۂ نرگس میں رہا　　میں اسی طرح کا خود بن کے رہا جس میں رہا
عمرِ ہنس بول کے اب تک تو گزاری ہے یہاں　　آب و دانہ نہیں معلوم کہ لے جائے کہاں

اس کے بعد وہ اپنے وطن والوں سے یہ کہتے ہوئے کہ "خوش رہو ہم وطنو! میں نہ رہا تو نہ رہا" چند نصائح کرتے ہیں۔

ایک تو ترکِ رزائل ہے اسے یاد رکھو　　دوسرا کسبِ فضائل ہے اسے یاد رکھو
مختصر حسن شمائل ہے اسے یاد رکھو　　منبعِ عیب و ہنر دل ہے اسے یاد رکھو
شر بھی ہے خیر بھی ہے مہر بھی ہے صبر بھی ہے　　بر بھی ہے بحر بھی ہے موج بھی ہے لہر بھی ہے
بے عدو گنجِ جواہر کا تمسک سمجھو　　دل بڑی شئے ہے مری بات نہ بے تک سمجھو
برگِ گل سے بھی زیادہ اسے نازک سمجھو　　بارگاہِ صمدیت کا تبرک سمجھو
دل کسی کا نہ دکھایا تو بڑا کام کیا　　دل دکھوں کی جو خبر لی تو بڑا نام کیا
دل کشادہ ہے کبھی اور کبھی تنگ بھی ہے　　مایۂ صلح بھی ہے، معرکۂ جنگ بھی ہے
باعثِ نام بھی ہے، یہ سببِ ننگ بھی ہے　　موم کا موم بھی ہے سنگ کا یہ سنگ بھی ہے
اس سے ہے شادی و غم، عیش و الم وابستہ　　مختلف رنگ کے پھولوں کا ہے اک گلدستہ
دل میں اک درد ہے اظہار کروں یا نہ کروں　　دل سے اک آہ شرر بار کروں یا نہ کروں
اپنا رُخ جانبِ اغیار کروں یا نہ کروں　　نیند کے ماتوں کو بیدار کروں یا نہ کروں

دل کا رہ رہ کے تقاضا ہے کہ فریاد تو کر
نہ سنے کوئی مگر اپنا سبق یاد تو کر

چار سال کے جلسوں میں پڑھی ہوئی نظموں کا اگر ایک عمومی نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان میں تدریجی جوش کا مظاہرہ نمایاں نظر آئے گا۔ قومی زندگی کے راستے میں کیفی کے قدم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ان کا قومی جذبہ بھی ابھرتا گیا۔

افسوس ہے کہ پانچویں کانفرنس سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی آوازیں ختم ہوگئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے جو نقوش چھوڑے ہیں زمانہ کی کوئی کروٹ ان کو نہیں مٹا سکتی۔

کیفی ایک حقیقی شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میکش

مملکتِ دکن کا واحد اردو و انگریزی ماہانہ فلمی رسالہ

زیر نگرانی
محمد حسام الدین خان غوری

زیر ادارت
ایل۔ سی بھلہ۔ بی۔ اے

مووی لینڈ

صنعت فلمسازی کی اصلاح و ترقی کا علم بردار

صنعت فلمسازی کے ہر پہلو پر گرانمایہ مضامین ❊ فلموں پر لاجواب تعمیری تنقیدی مقالات

نگارخانوں کی رنگین و درد ماں خیز کہانیاں ❊ فلمی زندگیوں کی اشک افشاں داستانیں

مغربی شہکار مضامین کے تراجم ❊ تازہ ترین فلمی حالات و دلچسپ معلومات

روح پر وجد طاری کرنے والی نظمیں ❊ اور دلپذیر و دلکش تصاویر

سے مزین ہو کر

ہر ماہ عیسوی کی پہلی تاریخ کو اسکا اردو ایڈیشن اور پندرہ تاریخ کو انگریزی ایڈیشن شایع ہوتا ہے۔

دونوں ایڈیشن کا سالانہ چندہ
للعہ (چار روپیہ آٹھ آنہ) مع محصول ڈاک

کسی ایک ایڈیشن کا سالانہ چندہ
عہ/ (دو روپیہ آٹھ آنہ) مع محصول ڈاک

قیمت فی کاپی ۳ /

نوٹ:۔ مضمون نگار حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ جہاں تک ہو سکے مختصر جامع اور معیاری مضامین ارسال فرمایا کریں۔ جگہ کی قلت کے باعث طویل مضامین کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی ہے

ملنے کا پتہ

مینجر مووی لینڈ، متصل بنسی لال پیٹھ سکندرآباد دکن

بچوں سے

سب رس بچوں اور بچیوں کو مضمون لکھنے کے لئے "مدرسہ کا پہلا دن" عنوان دیا گیا تھا لیکن اب بہت کم مضمون وصول ہوئے۔ سید سعید صاحب (مدرسہ عالیہ) کا مضمون سب سے اچھا رہا جس کو اس شمارہ میں شایع کیا گیا ہے۔ آئندہ مہینے کے مضمون کا عنوان "طالب علم کے اخلاق" ہوگا۔ توقع ہے کہ یہ مضمون بہت دلچسپی سے لکھا جائے گا۔

"اقبال نمبر" کے انعامات کا تصفیہ ہو گیا ہے جو یہ ہے۔

۱۔ "اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی" از ح۔ انصاری متعلم رزیڈنسی ٹدل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمید الدین صاحب مہتمم سب رس)

۲۔ "دوستوں کا مکالمہ" از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین احمد صاحب انصاری)

۳۔ "محسن قوم اقبال (نظم)" از لطیف النساء بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب)

یہ سب انعامات نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ ادبیات اردو پہلی اگسٹ کو ادارہ کے سالانہ جلسہ میں تقسیم فرمائیں گے۔

پہیلیوں کے حل:۔

جولائی کے سب رس کی پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں۔ (الف) انڈا، مہتر، (ب) انڈا، ڈھول۔ (ج) چراغ۔

حسب ذیل سب رسی بھائیوں نے وقت پر حل روانہ کئے۔ حبیب شمس سٹی کالج (۲) محمد اسد اللہ خاں سٹی کالج (۳) لائق علی خاں سٹی کالج (۴) جن کے حل وقت کے اندر وصول نہیں ہوئے ان کے نام درج نہیں کئے جاتے۔ کئی بچوں اور بچیوں نے نئی پہیلیاں بھی بھیجی ہیں لیکن آئندہ سے وہی نئی پہیلیاں چھاپی جائیں گی۔ جن کے ساتھ پہلی پہیلیوں کے حل بھی روانہ کئے گئے ہوں۔

انعامی معمہ:۔

سب رس کے معاون مسیح الدین خاں متین نے ایک انعامی معمہ بھیجا ہے جس کے حل پر ایک کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ کتاب وصول ہو چکی ہے۔ دوسرے سب رسی بھائی اور بہنیں بھی اسی طرح انعامی چیزیں بھیج کر سب رس کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں۔

ادارہ

اشارے آڑے

(۱) اس معمہ کا حل ـــ میں شایع ہوگا۔
(۲) گولکنڈہ کا غدار وزیر (۳) ملکہ مصر کا نام (۴) موت کو خوشی کے ساتھ لبیک کہنے والا مسلم (۵) چہرہ کا خوبصورت حصہ (۶) آگرہ کی مشہور عمارت (۷) جس شخص کو اپنے ـــ سے محبت نہیں ہوتی وہ کسی سے سچی محبت نہیں کر سکتا۔ (۸) سچا ـــ وہ جس کو اپنی دھن میں کھانے پینے کی بھی پروا نہ ہو۔... (۹) بمعنی شیر ببر (۱۰) دارالحکومت۔

۱ س		ر				
۲	ی		ج	م		ہ
۳ ذ		ل			ا	
۴ ا		ب		ل		
۵	خ		ا			
۶	ا		م			
۷		ن				
۸	ا		ر			
۹	ض		ف			
۱۰ ر	و					

تارا

اے رات کو جگمگانے والے
اے دن کو نظر نہ آنے والے

بتلا تو مجھے کہ کون ہے تو
کیا رنگ ہے تیرا اور کیا بُو

شعلہ ہے ذرا سا آگ کا، یا
ننھا سا چراغ ہے خدا کا

او ننھے سے جگمگاتے تارے
سچ سچ یہ بتا دے مجھ کو پیارے

ہر رات کو یوں چمک چمک کر
چھپتا ہے کہاں تو صبح جا کر

ہر چند کہ دن میں تجھ کو ڈھونڈا
پایا نہ پتہ ترے مکاں کا

بس ہو تو میں آسماں پہ آؤں
اور توڑ کے تجھ کو ساتھ لاؤں

تو تو ہے مزے سے آسماں پر
دل میرا ترستا ہے یہاں پر

دم بھر کے لئے تو پاس آجا
بس ہاتھ میں آ کے پھر چلا جا

آنکھیں تری روشنی سے بھر لوں
کھیلوں ترے ساتھ، پیار کر لوں

لطیف النساء بیگم

کاش میں ایسا نہ کرتا

ایک سبق آموز افسانہ

جب میری عمر گیارہ سال کی تھی ایک نوجوان شخص ناصر نامی ہمارے پاس نوکر ہوا۔ یہ جوا بہت کھیلا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اسے دوسرے نوکروں کے ساتھ بھی کھیلتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھ میں بھی دن بدن جوئے کا شوق بڑھتا گیا۔ آخر کار میں نے ناصر کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اگر میں کسی دن ہار جاتا تو والدہ کے روپیوں کے صندوق سے ایک دو روپے تو ضرور اڑا لیتا۔ میری عادت اس قدر بڑھ گئی کہ میں اگر کسی دن نہ کھیلتا تو میری طبیعت کسی نامعلوم وجہ سے کبیدہ ہو جاتی۔ میری اس خفیہ کارروائی سے میرے والدین بالکل واقف نہ تھے۔ اور اگر کسی دن میرے پاس بہت پیسے رہتے تو وہ کبھی یہ بھی خیال نہ کرتے کہ مجھے کہاں سے ملے ہیں اور کس نے دئے۔

—— ۲ ——

جمعہ کا دن تھا۔ تعطیل تھی اور میں بہت خوش تھا کہ آج خوب موقع ملے گا۔ میں اور ناصر کوٹھے پر چڑھ گئے اور تاش کھیلنے

سب روپے گئے۔ آج کا ایسا منحوس دن تھا کہ میں نے ایک پیسہ بھی نہ جیتا جو کچھ بھی تھا ہار گیا۔ میں اپنی قسمت کو بار بار کوسنے لگا۔ اور پیسے فراہم کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ مگر بے سود ناچار میں نے مجبور ہو کر ناصر سے کچھ قرض لیا مگر وہ بھی ہار گیا۔

۳

ایک دن کا ذکر ہے کہ شام کے وقت والد صاحب کے پاس کہیں سے تقریباً چار سو روپے آئے۔ والد نے مجھے رقم دے کر کہا کہ تجوری میں رکھ آؤ۔ میں نے رقم لی اور تجوری میں رکھنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ روپیوں کو دیکھتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا اور جوا کھیلنے کے لئے بکمال چالاکی دس روپے نکال لئے اور باقی روپے تجوری میں۔ میں نے چرائے ہوئے روپے اپنے کمرے میں میز کی دراز میں رکھ دیے۔ کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہاں تک کہ دنیا و مافیہا کا کچھ دھیان نہ رہا۔

۴

جب رات کو والدین نے روپیوں کا حساب کیا تو دس روپے کم نکلے۔ والد کا گمان مجھ پر تھا مگر والدہ نے کہا کہ میرا لڑکا ہرگز چور نہیں ہو سکتا آخر کار والدین نے میرا تمام کمرہ ڈھونڈ ڈالا۔ اور روپے میز کی دراز سے مل گئے۔ والدین غصہ سے لال پیلے ہو گئے مگر رات کا وقت تھا مجھ کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

۵

صبح کو اُٹھا ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتہ کیا۔ اور کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک مجھے کل والے روپے یاد آئے۔ مگر دیکھا تو میز کی دراز خالی خولی تھی۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ملازمہ نے آکر کہا کہ آپ کو ابا جان بلاتے ہیں۔

میں سمجھ گیا کہ ضرور میری چوری پکڑی گئی۔ اور والد ہی نے دراز سے روپے نکال لئے ہیں "مجبوری کا دوسرا نام صبر" ڈرتا ڈرتا والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والد نے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور کہنے لگے کہ تمھارے پاس دس روپے کہاں سے آئے۔ میں نے صاف انکار کیا۔ مگر والدین نے مجھے بہت ڈرایا اور مجھے اپنے جرم کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ اس واقعہ سے میرے ضمیر نے مجھ پر بہت کچھ لعنت، ملامت، اور نفرین کی اور میں نے پورے طور پر عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی جوے کی نوبت میں نہ پھنسوں گا۔

۶

اس واقعہ کو گزرے ہوے پورے دس سال ہوتے ہیں اور میاں ناصر تو ایسے غائب ہوے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ والد بھی ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔

اب میری عمر ۲۱ سال کی ہے میں والدہ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ آج کل میرے گھر کے کاروبار اعلیٰ پیمانہ سے چل رہے ہیں۔ میرا جوا نہ کھیلنے کا عہد اب بھی قائم ہے۔ کبھی کبھار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ میں کچھ روپیہ لگاؤں مگر ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور ہر جواری سے اس سبق آموز واقعہ کے پڑھنے کی استدعا کرتا ہوں۔

محمد کمال خاں متعلم
(مدرسہ عالیہ)

نظام ساگر کی سیر

ہم نے نظام ساگر کو تین دن کے لئے جانے کی ٹھانی تھی اور ضروری انتظام کے بعد ایک دن موٹر میں ہم چھ آدمی روانہ ہوئے۔ میرے سوا امی جان بڑے اور چھوٹے ماموں اور بڑی آپا بھی تھیں۔ کھانے کی بہت سی مزے مزے کی چیزیں ساتھ تھیں اور ہم نے ایک کیمرا بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ راستے میں ہم بڑے خوش تھے کبھی گاتے تھے کبھی ہنستے تھے اور طرح طرح کے مناظر دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا کہ ہمارے ملک میں کیسے کیسے خوشنما مناظر موجود ہیں۔ جب ہم (۶۰) میل کا سفر طے کر چکے تو پھٹ سے ایک ٹائر پھٹا خیر خدا کا شکر ہے۔ کہ ہمارے پاس ایک زائد ٹائر تھا کہ وقت ضرورت کام آئے۔ میرے بڑے ماموں جو بڑے مذاقی ہیں انھوں نے جب دیکھا کہ ہم سب سوائے امی کے اتر کر ٹائر لگانے میں شوفر کی مدد کر رہے تھے۔ تو انھوں نے جلدی سے ہماری ایک تصویر لے لی جب دوسرا ٹائر درست ہوگیا تو پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا اب سب خوش اور اطمینان کے ساتھ جا رہے تھے۔ خدا کی شان دیکھئے کہ (۳) میل بھی طے نہ ہوئے تھے کہ پھر پھٹ سے وہی ٹائر پھٹا جو درست کرکے لگایا گیا تھا۔ اب تو سب کے ہوش جاتے رہے۔ اور خاص کر ڈرائیور کی حالت دگر گوں ہوگئی۔ ہم سب املی کے ایک پیڑ تلے بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ہماری اس جماعت میں ایک میں ہی سب سے کم عمر تھی وہی مذاقی ماموں صاحب نے مجھے ڈرانا شروع کیا اور کہا کہ رات کو اگر ہمیں یہیں رہنا پڑے تو کہاں بیٹھیں گے۔ اور پاس روشنی بھی نہیں ہے۔ اگر جنگلی جانور حملہ کرے تو کیا ہوگا بہرحال اس طرح کی ڈراؤنی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے دو آدمی گزرے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا یہاں قریب میں کوئی گاؤں ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا اس یہاں سے ۳ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کوم نور ہے سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سب کو ناگوار گزرا کہ موٹر کو اس طرح ڈھکیلتے ہوئے لے جائیں۔ لیکن مجبوری تھی سب موٹر میں بیٹھ گئے سوا ان دو لوبچارے ماموں کے جو دھوپ میں موٹر کے ساتھ ساتھ ٹائروں کی طرف نظر جمائے چل رہے تھے۔ دھوپ کی تیزی اور بھوک سے چڑچڑاہٹ اور بات بات پر غصہ آتا تھا۔ گاؤں والوں کا موٹر کو دیکھ کر ہنسنا تو اور بھی غضب ڈھا رہا تھا پانچ میل کی رفتار سے موٹر ٹھکتے ٹھکتے چل رہی تھی بعض وقت ہم بھی ہنستے اور بعض وقت موٹر کی حالت پر ترس کھاتے تھے۔ کہ اس کی بندی سے بدتر حالت بن گئی ہے۔ خدا خدا کرکے وہ گاؤں آگیا اور ہم نے ایک گھنے درخت کے نیچے موٹر روک لی۔ درخت کے سامنے ہی ایک بہت بڑی پرانی مسجد تھی اور مسجد کے قریب ہی ایک بہت وسیع تالاب تھا جس کا کٹہ ایک میل کا ہوگا ہم نے مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ لیکن کھانا کس کے حلق سے اترتا تھا جب کہ واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے ایک بڑے میاں گذرے امی جان کے دل میں یہ آیا کہ اب یہاں رہنا نہیں ہو سکتا کھانا رکھ کر کیا فائدہ اس غریب مسلمان بوڑھے کو دے کر ثواب حاصل کریں اور اگر اللہ میاں خوش ہو گئے تو شاید جانے کی کوئی صورت کر دیں۔ انھوں نے اپنا ارادہ ہم پر ظاہر کیا ہمیں بھی یہ بات پسند آئی اور ہم نے بڑے میاں کو بلا کر کھانا دیا اور کھانے سے فراغت پاکر ان سے باتیں کرنے لگے۔ اور سب کے سب ان کو ناناکہہ کر پکارنے لگے۔ باتوں باتوں میں ہم نے معلوم

کر لیا کہ وہاں بھی سرکاری بس آتی ہے۔ یہ سن کر سب کو ذرا تسکین ہوی جب ہماری واپسی کی خوشی ہوتی تو موٹر کی فکر ہوتی کہ معلوم کتنے دن اس کو یہاں پڑے رہنا ہوگا۔ دوسرا دن انگریزی مہینوں کا نیا سال تھا۔ ٹائروں کی دکانیں بند ہونے کا ڈر تھا۔ اس سے بھی زیادہ ڈر یہ تھا کہ اگر ابا کو خبر ہو گئی کہ موٹر جنگل میں پڑی ہے .... تو پھر غضب ہو جائے گا۔ جب نانا موٹر کی تسلی دیتے تو کوئی اور گاؤں والا آکر کچھ اور خبر سناتا کہ کبھی موٹر آتی ہے۔ اور کبھی نہیں آتی۔ نانا نے یہ کبھی سنایا کہ بعض وقت لوگوں کی کثرت سے موٹر والا موٹر نہیں روکتا۔ یہ سنتے ہی ہم سب ڈر گئے۔ نانا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں شیر بھی آیا کرتے ہیں اور کئی مرتبہ آکر کتوں کو کھا گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی اب تو ڈر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نانا نے سب کو ہمت دلائی کہ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ سب وہیں رات کو سونا اور صبح کو چلے جانا۔ یہ سن کر ہمارا خوف جاتا رہا۔ نانا بڑے بکواسی تھے اپنی بہادریوں کا ذکر اور ادہر ادہر کی دوسری باتیں کرتے رہے۔ اگر اب جو بس کا ذکر کرتے تو ہم کو بالکل ڈر نہ ہوتا کیونکہ نانا کے گھر کا بھروسہ تھا۔ امی جان کو مسجد میں چھوڑ کر ہم سب تالاب پر گئے۔ وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اچھے منظروں کی تصویریں لیں۔ امی کے بلانے پر ہم تالاب سے واپس آئے اور ایک نئی خبر نانا کی زبانی سنی کہ بس کوئی پانچ بجے آئے گی۔ یہ سنتے ہی ہم نے چلنے کی شروع کی۔ بچھونے باندھتے تھے اور دوسرے کام میں جب ہم مصروف تھے۔ تو چھوٹے ماموں نے پھر ایک تصویر بطور یادگار لے لی۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ وہ پوری صاف نہیں آئی کچھ حصہ سیاہ پڑ گیا۔ جانے سے پہلے ہم نے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا کہ موٹر کی حفاظت کرتے رہنا اور ہم وہاں تمہارے پاس پہنچتے ہی ٹائر بھیج دیں گے۔ بچا ہوا سب کھانا ہم اس کے حوالے کر دیا اور بس کے انتظار میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انتظار میں ساڑھے پانچ کے قریب ہو گئے۔ ادہر سے ایک گاؤں کا آدمی آیا اور باتوں باتوں میں اس سے معلوم ہوا۔ کہ بس (۶) بجے آئے گی یہ سن کر نانا پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے ہم سے جھوٹ کہا۔ پھر نانا آکر کہنے لگے کہ آپ کو بس لے جا کر ایک جگہ پر چھوڑے گی جہاں ایک دوسری بس اس کے انتظار میں رہے گی اور وہ آپ کو لے جا کر ایک اسٹیشن پر چھوڑے گی جہاں سے آپ ریل کے ذریعہ حیدرآباد پہنچیں گے۔ شام ہو رہی تھی اور ہم موٹروں کی آواز پر چونکتے جاتے تھے کہ شاید بس آ رہی ہوگی انتظار کرتے کرتے ہم سب ناامید ہوئے تھے۔ خیر ساڑھے چھ بجے جو بس کی آواز ہمارے کانوں میں آئی سب ایک دم آئی بس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ امی نے ماموں کو کہا کہ جا کر دیکھیں کہ بس بھری ہوی تو نہیں ہے۔ انھوں نے خوشی سے آکر کہا کہ بس میں چند لوگ ہیں ہم سب مردانہ حصہ میں بیٹھ گئے۔ سوائے امی اور بڑی آپا کے جو زنانہ حصے میں بیٹھ گئیں۔ بس ہمیں اسٹیشن پر لے جا کر چھوڑی ٹکٹ لے کر ریل میں سوار ہوئے اور پھر کاچی گوڑہ اسٹیشن پر گیارہ بجے پہنچے گھر جانے کے لئے ٹکسی موٹر کی بہت تلاش کی گئی۔ لیکن کوئی ٹکسی نہیں ملی مجبوراً ٹانگہ میں بیٹھ کر چرخ چوں چرخ چوں کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو ساڑھے گیارہ ہوئے تھے اور پھاٹک بند تھی دروازہ خوب مار، شور و غل کیا چوکیدار نیند سے چونک کر آیا اور پھاٹک کھولا جب وہ ہمیں ٹانگہ میں دیکھا تو حیران تھا کیا معاملہ ہے۔ جب ہم اندر گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ خالہ جان اور ایک ماما کمرے کے دروازے بند کر کے سو رہے ہیں۔ ہم جا کر دروازہ کھٹکھٹائے تو ڈرتے ڈرتے انھوں نے دروازہ کھولا اور ہمیں اتنی جلد واپس ہوتے دیکھ کر بہت حیران ہوئے جب ہم نے اپنا پورا قصہ سنایا تو سب کے ہنستے ہنستے پیٹوں میں بل پڑ گئے صبح کو

موٹر کی فکر ہوی تو خیال آیا کہ موٹر جنگل میں پڑی ہوی ہے۔ اس کو فوراً کسی طرح سے منگوانا چاہیئے ابا جان کو جب معلوم ہوا تو وہ اس وقت دادا کی موٹر میں جاکر دو نئے ٹائر اور ٹیوب خرید کرلائے اور ایک ٹکسی موٹر منگوا کر اس میں بھجوادیے ایک نوکر کو بھی ساتھ کیا ہم یہاں اپنی موٹر واپس آنے کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ خدا خدا کر کے شام کے سات بجے موٹر خیر و خوبی کے ساتھ پہنچی۔ مگر ڈرائیور بہت تھکا ہوا اور دنیا سے بیزار نظر آتا تھا۔ ایسے مزوں سے ہمارا نظام ساگر کا سفر ختم ہوا۔

مظفر سلطانہ (سنیٹ جارجز گرامر اسکول)

بالا حِصار

بنایا ہے کیا خوب مٹی کا گھر	مرے بھائی جاں ہیں بڑے کاریگر
بنا کیسا پیارا یہ گھر واہ وا	نہ ہوگا محل کوئی اس شان کا
لگایا ہے کیا خوب سبزے کا رنگ	جو دیکھے اسے بس وہ ہوجائے دنگ
کرو بھائی جاں صاف چوٹی کو یوں	لگادو بس اب چار اس پر ستوں
پڑے اس پہ چھپر جو اک گھاس کا	تو آئے نظر پھر یہ کیسا بھلا

نہ مٹی کا گھر ہے نہ ہے یہ محل	لگاکر ستوں گھر بنائیں گے کل
بس اک چاندنی پھر بنائیں گے ہم	منڈیر ایک اس پر لگائیں گے ہم
نہیں تم کو نٹھی ذرا بھی قرار	بناتا ہوں میں دیکھو بالا حصار

لطیف النسا بیگم

لطیفہ

لڑکا:- دادا جان کیا آپ کی عینک سے ہر چھوٹی چیز بڑی معلوم ہوتی ہے ؟

دادا:- ہاں بیٹا۔

لڑکا:- اچھا تو دادا جان جب آپ مجھ کوئی چیز دیا کریں تو برائے مہربانی عینک اتار کر دیا کیجئے۔

مرزا محمد ارشد مختار بیگ

نانی اور انکی شیر نواسی

خداوند کریم ہماری نانی اماں کو سلامت رکھے جو ہر وقت ہمارے لئے اسباب تفریح مہیا کرتی رہتی ہیں۔ مزاج کی بھی اللہ رکھے عجیب ہیں۔ یوں تو والدہ صاحبہ کی سگی والدہ نہیں، بلکہ رضائی والدہ ہیں۔ مگر چونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے وہ شروع ہی سے ہمارے ہاں رہتی ہیں۔ وہ کسی ضرورت سے اپنے کسی عزیز کے ہاں چلی بھی جاتی ہیں تو دل بہت ہی اداس رہتا ہے۔ مجھے خاص طور پر ان سے بہت دلچسپی ہے اگرچہ وہ ہر وقت مجھ پر برستی رہتی ہیں مگر ان کو مجھ سے کچھ محبت بھی ہے۔ ہماری نانی اماں کو خیر سے دکھائی بھی کم دیتا ہے، اس لئے آپ ہر وقت عینک چڑھائی رہتی ہیں۔ اور جب کوئی ان کے سامنے ہنستا ہے تو ان کو سخت غصہ آتا ہے۔ اور جب روٹھتی ہیں تو ان کا منانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ان کے آگے مٹھائی لا کر رکھ دے تو وہ فوراً من جاتی ہیں۔

ایک اور بات ان کے متعلق قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان کو شیشے کے گلاس سے سخت دشمنی ہے اور اگر کوئی بھولے بسرے شیشے کے گلاس میں پانی دیدے تو وہ اپنی توہین خیال کرتی ہیں۔ ایک دن کا ذکر سنیئے کہ میں نانی اماں کے پاس بیٹھی ان کو بنا رہی تھی۔ نانی اماں بیٹھی کرتہ سی رہی تھیں۔ اور خیر سے عینک بھی لگائے ہوئے تھیں۔ سوئی میں تاگا کسی طرح نہ ڈالا جاتا تھا آخر میں نے پرو دیا۔ انھوں نے جو سینا شروع کیا تو گرہ لگانی یاد نہیں رہی۔ اور جونہی سوئی کو کھینچا تو تاگا تمام کپڑے سے نکل آیا۔ خدا جانے کتنی بار انھوں نے ایسا کیا۔ آخر مجھ سے ہنسی نہ رک سکی اور میں بے اختیار ہنس پڑی۔ میں نے کہا نانی اماں گرہ تو لگا لو تو وہ الٹی خفا ہو گئیں۔ کیونکہ ان کی سمجھ میں میرا مطلب نہیں آیا میں جو کہتی کہ گرہ لگا لو تو وہ گز اٹھا کر ناپ لیتی تھیں اور کہتی سولہ ہی گرہ تو ہے اسے کتنی بار ناپوں وہ میرے لفظ "گرہ" کا مطلب نہ سمجھی تھیں۔ جب ناپتیں تو مجھے اور زیادہ ہنسی آتی تھی اور ان کا غصہ بڑھتا۔ اتنے میں اوپر سے والدہ صاحبہ نے آواز دی کہ تمھاری نانی اماں کیا کر رہی ہیں ان سے کہنا کہ پہلے ذرا چائے پی لیں۔ میں نے جواب دیا وہ دجّال والی گدی سی رہی ہیں، گرہ لگانی یاد نہیں رہتی اور جب میں گرہ لگانے کو کہتی ہوں تو کرتہ اٹھا کر ناپ لیتی ہیں۔ میرے اس کہنے پر نانی اماں بس آگ بگولہ ہو گئیں اور لگیں مجھے صلواتیں سنانی اور اس کے بعد سے تو وہ اس قدر خفا ہو گئیں کہ چار پانچ روز تک قطعی نہ بولیں اور میرا سامنے آنا بھی انھیں ناگوار گزرتا تھا۔

اتفاق کی بات دو چار دن بعد ہی ان کے سر میں سخت درد ہوا سب لوگ ان کے پاس جا بیٹھے، میں بھی پہنچی اور کہا نانی اماں تمھارا سر دبا دوں لیکن انھوں نے مجھے سخت غصے سے پرے ہٹا دیا مجھے کچھ ہنسی آگئی اور میں اپنے کمرے میں چلی گئی آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں ان کے کمرے میں پھر آگئی۔ ہمشیرہ صاحبہ ان کا سر دبا رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور آہستہ سے کہا نانی اماں دودھ پئیں گی لاؤں؟ دودھ کا نام سنتے ہی نانی اماں کے دل کی کلی کھل گئی اور کہنے لگیں کہ بٹی سامنے تو آ تیری صورت دیکھنے کو جی ترس گیا۔ خیر میں سامنے آگئی تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا

بچی وہ دودھ کہاں سے لاؤ۔ میں جلدی سے جاکر دودھ لے آئی تو وہ من گئیں۔ خیر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اور سنیے ایک روز نانی اماں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا کہ بیٹی ذرا ایک گلاس پانی اور تھوڑی سی چینی لا دو مجھے پھر شرارت سوجھی اور میں ایک شیشے کے گلاس میں پانی اور ایک پلیٹ میں چینی لے آئی۔ اور کہا لو نانی اماں پیو۔ نانی اماں آئیں تو جائیں کہاں گلاس میرے ہاتھ سے لیا اس زور سے پھینکا کہ چور چور ہو گیا۔ اور لگیں مجھ پر خفا ہونے۔ میں نے فوراً چینی کی پلیٹ آگے کرتے ہوئے کہا لیجیے شکر۔ وہ فوراً ہنس پڑیں اور کہا بیٹی برا نہ مانیو میں ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ ہاں ہماری نانی اماں کو نرم چیز زیادہ پسند ہے ہر ایک چیز کو پہلے دبا کر دیکھتی ہیں اور پھر کھاتی ہیں ایک دفعہ ہماری ایک جگہ دعوت تھی نانی اماں بھی ہمارے ساتھ تھیں اگر ان کو نہ لے جاتے تو اپنے ہی جانے کی کس کو امید تھی دعوت میں ہم پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد کھانا چنا گیا مختلف قسم کھانے تھے مٹھائی بھی تھی۔ کھانا جو شروع ہوا تو نانی اماں نے سب سے پہلے مٹھائی پر ہاتھ ڈالا میں بیچ میں شرارت سے بول اٹھی نانی اماں دیکھ کر کھائیے۔

نانی اماں۔ کیا دیکھ کر کھاؤں ؟

میں۔ یہی کہ پہلے اسے دبا کر دیکھ لیں۔ نانی اماں نے یہی کیا کہ گلاب جامن کو دبا کر دیکھا، وہاں یہی تھا کہ شیرے کی پچکاری تمام ان کے کرتے دوپٹے پر۔

میں۔ نانی اماں دیکھا اس میں سے کیا نکلا ؟ ذرا اور دبا کر صاف کر لیجئے نہ معلوم اس میں کیا بلا بھری ہوئی ہے۔ نانی اماں میری شرارت کو نہ سمجھیں اور دبایا تو شیرہ گردن پر گرا۔

گلاب جامن تو خیر انھوں نے چورا ملیدہ کر کے کھا لیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد نانی اماں کا ریشمی دوپٹہ اور کارگے کا کرتہ چپک کر گلے کا ہار ہو گیا ادھر گردن پر شیرہ سوکھ کر کھال تڑخنے لگی۔ چنانچہ ان کا غضبی خانہ مجھ پر نازل ہوا اور لگیں بے نقط سنانے میں گھبرائی اور اماں سے کہا جلدی چلو ورنہ یہ زیادہ برس پڑیں گی اور خواہ مخواہ کرکری ہوگی۔

غرض ہم گھر آئے اور ان کے کپڑے بدلوائے تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ خدائے تعالیٰ انھیں زندہ رکھے عجب طرفہ معجون ہیں اور روزانہ ہمارے لئے ہنسی دل لگی کے سامان فراہم کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہماری بھی دعا ہے ؎

وہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ارجمند ریحانہ (از دہلی)

کام کی باتیں

(دوسری قسط)

(۱) کمینوں کے ساتھ بیٹھنے میں علمیت کا خون ہوتا ہے۔ برابروں کے ساتھ برابری حاصل ہوتی ہے۔ اور بڑے لوگوں کے ساتھ بندگی۔ (ہٹوپادیسہ)

(۲) اپنے دل کو غم و الم سے دور رکھو۔ اور اس تکلیف کا خیال نہ کرو جو ابھی نازل نہ ہوئی ہو۔ (فردوسی)

(۳) کوئی شخص دنیا میں باقی رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔ سوائے اس کے جس نے نیک نام چھوڑا ہو۔ (سعدی)

سیدہ عظیم النساء بیگم (از میسور)

طلسمی قالین

ایک بادشاہ کے تین[3] بیٹے تھے۔ سب میں بڑے کا نام قمرؔ منجھلے کا نام انورؔ اور چھوٹے کا نام اظہرؔ تھا۔ یہ تینوں اپنی چچا زاد بہن قیصر سلطانہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔

قیصر سلطانہ اپنے زمانے میں حسن دلنواز کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی اس کی نقرئی اور بے عیب پیشانی شکن سے پاک صاف چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتی تھی ناک سیدھی بے عیب جسم نازک اور سڈول تھا۔ تینوں شاہ زادے اس ارضی حور سے دلی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنی جانیں اس مہ جبیں پر قربان کرنے کو تیار تھے۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اس کی الوداعی سنہری کرنیں سرسبز درختوں اور شفاف پانی کی لہروں پر پڑ کر نہایت دلفریب اور دلکش معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہی وقت ان دلدادگان حسن کے لئے نہایت پر خطر ثابت ہوا۔ یعنی بادشاہ نے تینوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تمھارے دلی حالات سے واقف ہوں۔ تم تینوں شاہ زادے اور میرے لخت جگر ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں قیصر سلطانہ کا ہاتھ دے کر بقیہ دو کا دل دکھاؤں۔ اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم میں سے جو سب سے بہتر تحفہ میرے لئے لائے گا وہی قیصر سلطانہ کا شوہر ہوگا۔ تم لوگ سفر کرو اور ٹھیک ایک برس بعد ایک ہی تاریخ کو اپنے تحائف میرے روبرو پیش کرو۔ شاہزادوں نے باپ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیا اور دوسرے دن تینوں مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ قمر شہر طوس پہونچا جہاں ایک دن شام کے وقت بازار میں اس نے مجمع کثیر دیکھا۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ ایک قالین فروخت ہو رہا ہے۔ پینتیس[35] ہزار اشرفیوں تک دام لگ چکے ہیں مگر قالین فروش کہتا ہے کہ چالیس[40] ہزار سے ایک کوڑی کم نہ ہوگی۔ قمر نے قالین کی صفت دریافت کی تو قالین فروش نے کہا کہ حضور یہ طلسمی قالین ہے۔ صفت اس میں یہ ہے کہ حضور اس پر بیٹھ کر جس مقام کا تصور فرمائیں خواہ وہ مقام کیسا ہی دور دراز ہو پلک جھپکاتے یہ قالین آپ کو وہاں پہونچا دے گا۔ قمر قالین کی یہ صفت سن کر پھولا نہ سمایا اور سوچا کہ اس سے بہتر تحفہ اب دستیاب نہ ہوگا۔ بے تامل چالیس ہزار اشرفیوں میں اسے خرید لیا۔ اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں جہاں مقیم تھا عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا کیونکہ واپسی میں ابھی بہت دیر تھی۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ دوسرے بھائی انورؔ کو بھی پیش آیا وہ سفر کی مصیبتیں سہتا ہوا ازمیر پہونچا وہاں بازار میں اسے ایک شخص دوربین بیچتا ہوا ملا انورؔ نے قیمت دریافت کی شخص مذکور نے کہا کہ پینتالیس[45] ہزار اشرفیاں انورؔ معمولی سی دوربین کی یہ قیمت سن کر ہکا بکا ہو گیا مگر اس شخص نے کہا کہ اس دوربین کے ذریعہ آپ گھر بیٹھے تمام عالم کی سیر کر سکتے اگر باور نہ ہو تو امتحان کر لیجئے انورؔ نے دوربین اس کے ہاتھ سے لے کر پہلے اپنی محبوبہ شاہ زادی قیصر سلطانہ اس کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو دیکھا دوربین بیچنے والا سچا ثابت ہوا اسے وہ سب لوگ جن کو وہ دیکھنا چاہتا تھا اس طرح نظر آئے گویا وہ اس کے پاس ہی موجود ہیں۔ انورؔ یہ نایاب تحفہ پاکر بیحد خوش ہوا فوراً منہ مانگی قیمت ادا کر کے دوربین خرید لی اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں تکان سفر دور کرنے کی خاطر مقیم

تیسرا بھائی اظہر زیتان پہونچا اُس نے وہاں کے بازار میں ایک میوہ فروش کو ایک سیب بیچتے ہوے دیکھا قیمت دریافت کی تو میوہ فروش نے پچاس ہزار اشرفیاں بتائیں اظہر ایک سیب کی یہ قیمت سن کر حیران سا ہوا تو میوہ فروش نے اُس سیب کی یہ خاصیت بیان کی کہ جس بیمار کو اس کا ایک ٹکڑا کھلا دیجیے خواہ اُس کی حالت کیسی ہی خراب ہو چکی ہو مگر ایک گھنٹے کے اندر بیمار تندرست ہو جائیگا۔ اظہر نے پہلے اسی شہر میں سیب کا امتحان کیا اور پھر پچاس ہزار اشرفیاں دے کر وہ سیب خرید لیا۔

جب اُن کی واپسی میں تین مہینے باقی رہ گئے تو تینوں بھائی ایک شہر کی کارواں سرا میں جہاں جُدا ہونے سے پہلے ملنے کا قول و قرار کر چکے تھے ملے ہر شخص نے اپنے اپنے تحفہ کا ذکر کیا۔ اور فوراً فوراً ایک نے دوسرے کو مبارک باد دی تھوڑی دیر بعد قمر نے انور سے کہا کہ بھائی عرصے سے ہیں اپنے والدین کی خبر نہیں ملی ذرا تم اپنی طلسمی دوربین سے دیکھو کہ اُن کا کیا حال ہے۔ انور نے صندوق سے دوربین نکالی اور دیکھ کر کہا ارے بڑا غضب ہوا جس کے لئے ہم لوگوں نے وطن چھوڑا والدین سے جدائی اختیار کی وہی (قیصر سلطانہ) دم توڑ رہی ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے یہ سن کر قمر اور اظہر نے بھائی کے ہاتھ سے دوربین چھین لی دیکھتے کیا ہیں کہ فی الحقیقت قیصر سلطانہ بستر مرگ پر دراز او رکوئی دم کی مہمان ہے۔ قمر نے کہا کہ بھائیو تاخیر کا موقع نہیں تم دونوں میرے طلسمی قالین پر بیٹھ جاؤ دم کے دم میں قیصر سلطانہ کے پاس پہنچ جاتے ہو یہ کہہ کر اس نے اپنا قالین بہ عجلت بچھایا انور اور اظہر بھی اپنا اپنا طلسمی تحفہ لے کر اُس پر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کی دیر تھی پلک جھپکنے میں تو شاید کچھ دیر بھی ہوتی ہو۔ مگر ان کو پہونچنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی۔ سب نے اپنے آپ کو اپنے محل کی چھت پر پایا۔ تینوں بھائی دوڑ کر قیصر سلطانہ کے کمرے میں گئے۔ جہاں بادشاہ اوران کی ماں بھی موجود تھی۔ دونوں کو بیٹوں کے خلاف توقع آجانے پر حیرت آمیز خوشی ہوی۔ اظہر نے فوراً اپنے طلسمی سیب سے ایک ٹکڑا کاٹ کر مریضہ کو دیا جس کے کھاتے ہی اس کے بے رنگ چہرے پر صحت کی سرخی دوڑ گئی اور چند منٹ میں قیصر سلطانہ تندرستوں کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گئی اس نے بھی بھائیوں کو دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ شاہی محل میں جہاں کچھ دیر پہلے موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔

بادشاہ نے بیٹوں کو گلے سے لگایا اور اُن کے سفر کے حالات سنے تینوں شاہزادوں نے اپنے اپنے طلسمی تحفے باپ کو نذر دیے بادشاہ ان تحفوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ فی الحقیقت یہ تحفے لاجواب ہیں مگر افسوس کہ میں اب بھی تم میں سے کسی کو بقیہ دو پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ انور کی دوربین کی بدولت تم قیصر سلطانہ کی نازک حالت سے آگاہ ہوے قمر کی قالین کی بدولت چشم زدن میں دور دراز مقام سے یہاں تک پہونچے اظہر کے سیب نے اُس کی جان بچائی۔ اس صورت سے مجھ پر اور میری بھتیجی پر تم تینوں کا برابر احسان ہے اب معاملے کے تصفیہ کی میں کوئی اور صورت نکالوں گا۔ تم تینوں اب اپنی اپنی جگہ جا کر آرام کرو۔

مرزا مظفر الدین احمد صادق
(چادر گھاٹ ہائی اسکول)

مردانے موسیٰ جانی

ایک چیونٹی اور چوہیا میں بڑی دوستی تھی۔ چیونٹی کا نام مورچہ جانی اور چوہیا کا نام موسیٰ جانی تھا۔ ایک دن چیونٹی چکی پیسنے بیٹھی اور چکی میں خود پس گئی۔ چوہیا کو اپنے دوست کی بیوقت موت کا بڑا رنج ہوا اور خاک سر پر ڈال ایک برگد کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

درخت نے چوہیا کا یہ حال دیکھ کر پوچھا "کیوں خاک بر سر موسیٰ؟" چوہیا نے جواب دیا "خاک بر سر موسیٰ مردانے مورچہ جانی مر جائیں، ہم مر جائیں؟" یہ سن کر درخت نے اپنے سب پتے گرا دیے۔ ایک کوا ادھر سے اڑتا آیا اور درخت پر بیٹھ گیا۔ درخت کے پتے گرے ہوئے دیکھ کر اس نے پوچھا "کیوں درخت بار کند؟ کیوں درخت بار کند؟" درخت نے کہا۔

درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جئیں؟"

کوے نے یہ بات سنی تو کیا کام کیا کہ اپنے بال و پر سب نوچ کھسوٹ ڈالے۔ جب یہ ندی کنارے پانی پینے گیا تو ندی نے کوے کو بے بال و پر ایک مضغۂ گوشت بنا دیکھ کر حقیقت حال دریافت کیا کہ "کیوں قلادہ چنگی منگی؟ کیوں قلادہ چنگی منگی؟" کوے نے جواب دیا۔

"قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جئیں؟"

پانی جو تھا وہ یہ سنتے ہی بہہ نکلا۔ پاس ایک کسان کا گیہوں کا کھیت تھا اس میں بہہ کر گیا۔ گیہوں نے کہا۔ "کیوں آیا تیرا پیرا؟ کیوں آیا تیرا پیرا؟" پانی نے کہا۔

"آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جئیں؟"

یہ سنتے ہی گیہوں جتنے تھے پٹ پٹ گر پڑے۔ کسان جو کھیت میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گیہوں جو کچھ دیر آگے لہلہا رہے تھے سب گرے پڑے ہیں۔ اس نے پوچھا "گیہوں گندا گرتی پڑتی؟ گیہوں گندا گرتی پڑتی؟" گیہوں نے کہا۔

گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جئیں"

کسان نے بیلدستہ جو اس کے ہاتھ میں تھا اٹھا کر اپنے پاؤں پر مار لیا۔ کسان کی بیٹی عاشقاں جو باپ کے لئے روٹی لایا کرتی تھی ادھر آ نکلی اس نے باپ کا جو یہ حال دیکھا تو پوچھا "کیوں بابا بیلدستہ کنی؟" باپ نے جواب دیا۔

"بابا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جئیں؟"

بیٹی جو تھیں یہ سنتے ہی جھٹ زمین پر لوٹ گئیں۔ ماں نے

بیٹی کو خاک میں غلطاں دیکھا تو پوچھا "کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی ہو کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی؟ عاشقاں بولی۔

"عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردا نے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

ماں نے روٹی پکانے کے لئے توا گرم کیا تھا اس پر جھٹ سے جا بیٹھیں۔ اتنے میں پڑوسن تکوا درست کروانے آئی۔ وہاں کیا دیکھتی ہے کہ عاشقاں کی ماں توے پر سوار بیٹھی ہیں؟ اس نے پوچھا کیوں عاشقاں مادراں توا کند؟ کیوں عاشقاں مادراں توا کند؟ عاشقاں کی ماں بولیں۔

"عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردا نے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

پڑوسن نے یہ سنتے ہی وفور غم میں تکوا اٹھا کر اپنی ناک میں گھسیڑ لیا جب پڑوسن گھر سے باہر نکلیں تو لوگوں نے کہا "کیوں پڑوسن تکوا کند کیوں پڑوسن تکوا کند" پڑوسن نے جواب دیا۔

"پڑوسن تکوا کند
عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردا نے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

یہ سننا تھا کہ سارے گاؤں کے لوگ مردا نے مورچہ جانی کی حسرت ناک موت پر آنسو بہانے لگے اور اس کے غم میں سوگوار ہوے۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے بھی ماتمی لباس زیب تن کیا اور امرائے عظام و تمام رعایا کو حکم دیا کہ مردا نے مورچہ جانی کی بے وقت موت پر اظہار تاسف کریں اور چالیس دن تک اس کا سوگ کریں۔

غرض جب چالیس دن ختم ہوے تو تمام شہر نے سوگ بڑھایا۔ درخت کی نئی کونپلیں پھوٹیں۔ کوے کے بال و پر نکل آئے۔ دریا اپنی روانی میں پہلے کی طرح چلنے لگی گیہوں سب بٹور لئے گئے عاشقاں اور اس کے ماں باپ اپنے دکھ درد سے چنگے ہوگئے۔ پڑوسن کی ناک کا زخم سوکھ گیا لیکن چونکہ اس نے مورچہ جانی کے غم میں سر پر خاک ڈالنا نہ چھوڑا اور اسی طرح تمام عمر گنوادی۔

سکینہ بیگم
(بیگم بیٹھ)

مدرسے کا پہلا دن

۱۰ جون اور پیر کا روز ہمارے اسکول کا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح امّی نے جگایا۔ میں پھر سوگیا۔ میں سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ مگر بات یہ تھی کہ رات میں ہماری پھوپی کی چوتھی تھی۔ کنبہ کے اکثر بچے جمع تھے بڑی رات تک ادودھم مچی رہی۔ دیر سے سونا ملا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ چوتھی کھیلنے کی اجازت نہ ملی اور رسم سے پہلے سلا دیئے گئے ورنہ ہم نے تو رات بھر جاگنے کی ٹھانی تھی۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ارجمند نے آکر جگایا۔ وہ تیار ہوچکی تھی۔ میں نے بھی جلد جلد غسل کرکے کپڑے بدلے اور ناشتہ کرکے تیار ہوگیا۔ بابا ابھی تک نماز پڑھ رہے تھے۔ امّی مریم کو حروف سمجھا رہی تھیں۔ ارجمند سبق دوہرا رہی تھی۔ میں نے بھی اپنا بیگ سنبھالا۔ آٹھ بجے ہم بابا کو خدا حافظ کہہ کر اور مریم، نرجس کو پیار کرکے سوار ہوئے اور چند منٹ میں اسکول پہونچ گئے۔

میں امّی جان اور ارجمند بی بی کو محبوبیہ میں چھوڑ کر عالیہ پہونچا تو بہت سے بچے آچکے تھے۔ اور الگ الگ ٹولیوں میں پھر رہے تھے۔ میں بھی اپنی جماعت کی ٹولی میں جا ملا۔ تھوڑی دیر میں سارے لڑکے آگئے اور آپس میں ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے لگے۔ ہماری رپورٹ گھر پر آئی تھی۔ جن بچوں کی رپورٹ پر "ترقی دی گئی" (Promoted) لکھا تھا وہ تو بہت خوش بحال تھے۔ لیکن جن کی رپورٹ پر یہ جملہ نہ تھا وہ بہت غمگین اور اداس نظر آتے تھے۔ ہم کو ان کی مایوسی سے رنج ہوا اور ہم نے اپنے امکان بھر ان کے خوش کرنے کی کوشش کی۔ میرے ساتھی اپنے انعامات کا بھی ذکر کر رہے تھے جو ان کی کامیابی پر انہیں ان کے والدین نے دیے تھے۔ ایک نے کہا "مجھے بابا نے ایک خوبصورت ہوائی جہاز لا دیا ہے" دوسرے نے کہا "مجھے بڑی پیاری بائیسکل ملی ہے"۔ میری باری پر میں نے کہا کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملا کیونکہ میں اس بار اول نہیں آسکا۔ ہاں جب اوّل آتا ہوں تو امّی اور بابا دونوں انعام دیتے ہیں۔ یہ چھوٹا فونٹن پن مجھے اس لئے ملا ہے کہ کردار اور اخلاق کی نسبت اچھی رپورٹ آئی ہے۔ میرے ساتھیوں نے چھوٹے بلو برڈ کو باری باری سے دیکھا اور مختلف رائیں قائم کیں۔

پھر ہم نے ان بچوں کو دیکھا جو دوسرے مدرسوں سے عالیہ میں شریک ہونے آئے تھے۔ وہ بے چارے کچھ پریشان سے تھے کیونکہ انھیں پھر امتحان دینا تھا اور پچاس فیصدی نمبر لینے تھے۔ بعض بچے انھیں یہ کہہ کر اور بھی ڈرا رہے تھے کہ جو بچہ نوے سے کم نمبر لیتا ہے وہ اس مدرسہ سے واپس کر دیا جاتا ہے۔

اتنے میں حاضری کی گھنٹی بجی اور پورا ہائی اسکول جمع ہوگیا۔ احمد علی خاں صاحب نے نئی جماعتوں کے لحاظ سے بچوں کے نام پڑھے اور میں حاضری کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسری جماعت (سکنڈ فارم) میں چلا گیا۔ وہاں ہم کو ڈسک درست کرنے اور اپنے اپنے نمبر لگانے پڑے۔ پھر حبیب اللہ صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے کامیابی کی مبارک باد دی ہم سے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ مختلف سوالات بھی کیے اور صحیح جوابات پر شاباش بھی دی۔

کھانے کی چھٹی میں ہم باہر آئے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ بچے نئی جماعتوں میں جاکر بہت خوش تھے۔ مدرسے کا پہلا دن ہونے سے اسباق بھی باقاعدہ نہ تھے۔ پرائمری کے بچے اچھل کود رہے تھے۔ جھولوں اور پھسل بنڈوں پر بچوں کا ہجوم تھا۔ کئی پھیری والے بھی آگئے تھے۔ کوئی "چورن مزے دار" کی آواز دے رہا تھا تو کوئی "کافی گرم" پکار رہا تھا۔ کہیں میٹھی گولیاں بک رہی تھیں

تو کہیں چنے والا اپنی ہنڈی لئے کھڑا تھا۔ میرے ساتھی اور دوسرے بچے مختلف چیزیں لے لے کر کھانے لگے۔ لیکن میں اور ایسے بچے جن کے پاس پیسے نہ تھے دوسری طرف کھیلنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اور بچے بھی آ گئے اور ہم سب ملکر دوڑنے کودنے لگے کالج کے بچے بھی دو دو چار چار ملکر پھر رہے تھے۔ جب کوئی جان پہچان کا بڑا لڑکا ادھر سے گزرتا تو "اچھے ہو سعید" پوچھ لیتا اور میں "جی اچھا ہوں" کہہ کر سلام کر لیتا تھا۔ جب تھوڑا وقت رہ گیا تو ہم نے جلد جلد کھانا کھایا اور گھنٹی پر جماعتوں میں پہونچے تھوڑی دیر بعد ہم کو جماعت کا ٹائم ٹیبل ملا اور کتابوں کی فہرست۔ ہم نے کورس کی کتابوں کے نام نقل کئے اور ٹائم ٹیبل اتارا۔ پھر ہمیں چھٹی مل گئی۔ ہم باہر آتے ہی نئے بچوں کا نتیجہ دریافت کرنے اس طرف پہونچے۔ بعض بچوں کو مدرسے کے فارم مل گئے تھے مگر اکثر نہیں لیئے گئے تھے۔ جس پر ان کے ساتھ والے خفا نظر آتے تھے۔ ہم نے ان لڑکوں سے باتیں کیں اور سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ "جی آپ کا نام" "آپ کے والد کا اسم شریف" "کہاں رہتے ہیں آپ" "آپ کون سے اسکول سے آئے ہیں جناب" "آپ کیا پڑھتے تھے وہاں" "اردو کی کونسی کتاب؟" "اور انگریزی کی؟" "حساب میں کیا کیا سکھاتے ہیں وہاں" وغیرہ جب وہ بے چارے جواب دیتے دیتے اور ہم پوچھتے پوچھتے تھک گئے تو پھر ہائی اسکول کا میدان تھا اور ہم خوب دوڑے۔ کھیلے کودے۔ فٹ بال لون ہاٹ۔ لنگوچہ۔ بھیڑیا بکری یہ ہمارے خاص کھیل ہیں۔ اس کے سوا املی کے جھاڑوں پر چڑھے۔ جھاڑ بندر کھیلا۔ ریت پر قلابازیاں کھائیں۔ پھسل بنڈوں پر اپنا اپنا کمال دکھایا۔ بعض ساتھیوں کو ستایا بھی۔ ڈرنے والوں کو زبردستی پھسل بنڈوں پر سے ڈھکیلا جھولوں پر بٹھا کر بڑے بڑے جھوکے دیے۔ پھر سب ریت پر بیٹھ گئے اور یہ ترانہ خوب لہک لہک کر گایا۔

ہم ہیں پودے مُلکِ دکن کے　　　توڑنے والے رسمِ کہن کے
ہم ہیں بندے اپنے وطن کے　　　دینے والے تن من دھن کے

دیس پہ مرنا کام ہمارا
دیس پہ مرنا کام ہمارا

غرض بڑا مزا آیا۔ چار بجے امی کو لینے محبوبیہ گیا۔ امی نے پوچھا "دن کیسا گزرا میرے لال" میں نے جواب دیا "مدرسہ چھوڑنے جی نہ چاہتا تھا۔ امی۔ آپ کے خیال سے آنا پڑا"۔ امی نے کہا تم بڑے اچھے بچے ہو سعید ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت کو سمجھنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

گھر آنے کے بعد بھی بعض شرارتیں یاد آ آ کر ہنساتی رہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے چا وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ عابد بھائی نے انجمن (انجمن بہبودئ اطفال) کی چند نئی کتابیں بتائیں جو اسی روز آئی تھیں۔ میز پر "پیام تعلیم" "سب رس" "نونہال" اور "آپا" کے تازہ پرچے رکھے تھے۔ چونکہ بارش کم کم ہو رہی تھی ہم سب بہن بھائی دیر تک وہیں پڑھتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سات بجے کھانا کھایا۔ کچھ دیر دالان میں ٹہلتا رہا۔ ہوم ورک تو تھا نہیں۔ بچھونے پر لیٹ کر "ترکوں کی کہانیاں" پڑھنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ یہ ہے میرے مدرسے کے پہلے دن کی سچی سچی روداد۔

سید سعید (مدرسہ عالیہ)

اخبار بینی

اخبار بینی کا ذوق آئے دن بڑھتا جا رہا ہے اور دنیا کے ہر حصے میں روزنامے کئی صفحے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ان اخباروں کے ذریعہ سے ملک کے ہر فرد بشر تک علم کی روشنی پہنچائی جاتی ہے۔ اور لوگوں کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ آج کل اخباروں میں اکثر حالات حاضرہ جن میں سیاسی سماجی اور معاشرتی حالات شامل ہیں زیادہ دلچسپی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں کیونکہ عوام کا رجحان اسی طرف زیادہ ہے بعض اخباروں میں محض سیاسی پروپگنڈے ہوتے ہیں۔ مگر ہماری نظروں میں وہی اخبار اور رسائل قابل قدر ہیں جن میں سماجی معاشی اور معاشرتی اصلاحی امور پر بحث کرنے کے بعد ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ کر عوام الناس کو ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں ان پر عمل کر کے میدان ترقی میں گامزن ہو جاتی ہیں۔

اب ہم پر اخبارات کی اہمیت واضح ہو گئی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر طالب علم کو جو اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور حالات حاضرہ سے واقف رہ کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اپنی قوم و وطن کو اگر کچھ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اخبار بینی کا ذوق پیدا کرے جس سے اس کے ذہنی اور عملی قوتیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اس کے علم و قابلیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے جو لڑکا اخبار پڑھنے کا عادی ہے وہ اپنے ساتھیوں میں ایک امتیاز پیدا کر لیتا ہے۔

ہمارے شہر میں بھی بہت سے اخبار و رسائل روزانہ شایع ہوا کرتے ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے مفید ہے۔ یہاں جتنے اخبار شائع ہوتے ہیں وہ سب اپنی خصوصیت سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسائل جن میں طلبا کی دلچسپی کے سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار و ماہوار شایع ہوتے ہیں۔ ان میں "سب رس" بچوں کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کے لئے شائع ہوتا ہے جس میں بچوں کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔ میں اس کو خاص طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

محمد عبد المنعم صدیقی (متعلم ششم کالج)

کالج کی علحدگی پر

مدرسہ سے جدا ہوا کالج
شوکت و شان لے گیا کالج

پہلے چھوٹا سا ایک پودا تھا
بڑھتے بڑھتے شجر ہوا کالج

جب ثمر کی طرح ہوا تیار
ٹہنیوں سے جدا ہوا کالج

ہم سے کالج کی سب بڑی بہنیں
چھٹ گئیں جب الگ ہوا کالج

ساری دنیا میں نام ہو اس کا
اعلیٰ ہر ایک کام ہو اس کا

نیر فاطمہ (زنانہ ہائی اسکول)

ادارۂ ادبیاتِ اردو

کے

قواعد و مقاصد

یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں معتمد کی تحریک اور دیگر موسسین کے تعاون سے قائم ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے، نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھایا جائے اور حیدرآباد کی علمی و ادبی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے۔

مجلسِ موسسین

ادارہ کے مقاصد کو روبہ عمل لانے، اس کی ترقی و اشاعت کے ذرائع پر غور کرنے، اس کے جمع و خرچ کی نگرانی اور علمی و ادبی امور میں مشورہ دینے کا کام مجلس موسسین کے سپرد ہے۔ یہ مجلس جن پانچ اصحاب پر مشتمل ہے وہ ادارہ کے موسسین ہیں۔

قواعد و ضوابط

مجلس موسسین نے ادارہ کے حسب ذیل قواعد و ضوابط معین کیے ہیں:-

(۱) سرپرست وہ ہوں گے جو ایک ہزار روپیے یکمشت یا ایک سو روپیہ سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ انکی خدمت میں تمام مطبوعات ادارہ بلا قیمت پیش کی جائنگی۔

(۲) معاون وہ ہوں گے جو ڈھائی سو روپیے یکمشت یا پچیس روپیے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کو سال بسال مطبوعات ادارہ بلا قیمت دی جائنگی۔

(۳) رفیق وہ ہوں گے جن کی علمی ادبی خدمات مستند سمجھی گئی ہوں، یا جو ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں غیر معمولی حصہ لے رہے ہوں جس کے اعتراف میں مجلس موسسین ان کو رفیق منتخب کرے گی۔

(۴) رکن وہ ہوں گے جو پچاس روپیے یکمشت یا چھ روپیہ سالانہ دیں۔ ان کو ادارہ کے جملہ مطبوعات و رسائل رعایتی قیمت پر دئے جائیں گے۔

ہمارے پچھلے معمہ کا نتیجہ و صحیح سربمہر حل

5	42	25
44	24	4
23	6	43

(۱) سردار جیون سنگھ صاحب بی۔اے امرتسر، ڈاکٹر ایم۔ ایس جگر نوشہرہ اور مس سرور بانو صاحبہ کھیوڑہ کے صحیح حل وصول ہوئے۔ اس لئے (۲۰۰۰) روپیہ صحیح حل کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۲) سب سے زیادہ حل (۶۶) سردار جیون سنگھ صاحب کے وصول ہوئے اس لئے۔ (۱۵۰۰) روپے کا دوسرا انعام ان کو ملا۔

(۳) ۲۰ جون تک سب سے زیادہ حل سردار صاحب کے تھے۔ اس لئے مزید (۱۰۰۰) کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۴) ۲۱ جون اور ۱۵ جولائی کے درمیان سب سے زیادہ اور دوسرے نمبر پر ڈاکٹر جگر صاحب کے حل ۲۲ وصول ہوئے اس لئے ہر دو انعامات (۱۰۰۰) روپے اور (۵۰۰) روپے ان کو دئے گئے۔

نوٹ :- (۱) واضح ہو کہ محترمہ مس سرور بانو کا صرف ایک حل وصول ہوا تھا۔ وہ صحیح تھا اس لئے وہ اول نمبر کے انعام کی مستحق ہوئیں۔
(۲) بعض نام نہاد اشخاص نے یوں ہی نام رکھ کر ہمارے معمہ کو حرف بحرف نقل کر کے اخبارات میں مشتہر کیا ہے۔ اس لئے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ایسے نام نہاد -/3 روپے کرایہ والے مکان کے کرایہ داروں کے دھوکہ سے بچیں جو ایسے ہی دھوکہ دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ برٹش بزنس کارپوریشن کی اپنی بلڈنگ ہے اس لئے آپ کا لگایا ہوا روپیہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس لئے آج ہی معمہ نمبر ۶ میں شمولیت فرما کر گرانقدر انعامات حاصل کریں۔

معمہ نمبر ۶ — گورنمنٹ کی طرف سے منظور شدہ — معمہ نمبر ۶

بنک میں سربمہر حل رکھا گیا ہے۔ جو ۱۷ اگست ۱۹۳۸ء کو ممبران کے عام اجلاس میں کھولا جائیگا اجلاس میں شمولیت کیلئے مقامی شرفاء مدیران اخبارات مسلم لیگ، احسان، زمیندار، ٹریبون، سول ملٹری گزٹ، نیرنگ، رودان، اختر، زمزم وغیرہ کو مدعو کیا جائیگا جو ممبران نتیجہ کے موقعہ پر حاضر ہونا چاہیں۔ اپنے خرچ پر تشریف لا سکتے ہیں۔

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ	**مبلغ** دس ہزار روپیہ **نقد انعام** Rs10,000	داخلہ کی آخری تاریخ ۱۷ اگست ۱۹۳۸ء

پہلا انعام (۵۰۰۰) روپیہ صحیح حل والے کو دوسرا انعام (۳۰۰۰) روپیہ سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو تیسرا انعام (۱۰۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں دوسرے نمبر پر ہوگا چوتھا انعام (۷۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں تیسرے نمبر پر ہوگا پانچواں انعام (۳۰۰) روپیہ اس کو دیا جائے گا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں چوتھے۔

	9	

ترکیب حل :- سامنے دیئے ہوئے ۹ خانے مربع میں خالی خانوں کو ہندسوں سے اس طرح پر کریں۔ کہ دائیں بائیں اوپر نیچے اور ترچھے غرض کہ جس طرف سے بھی شمار کریں ہر قطار کا مجموعہ ۲۷ ہو۔ جو ہندسہ آپ چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ کسر یا ٹہ استعمال نہ ہوگا

فیس داخلہ و شرائط :- فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک سے زائد بھی آپ جسقدر حل بھیجنا چاہیں سفید کاغذ پر بھیج سکتے ہیں اور فیس داخلہ بحساب ایک روپیہ فی حل بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ رسید منی آرڈر حل کے ہمراہ ارسال کریں مشکوک حل غلط تصور ہوں گے درست اور مستحق انعام حل وہ ہوگا جو ہمارے سربمہر حل سے خانہ بخانہ اور ہندسہ بہ ہندسہ مطابقت کریگا۔ جو بنک میں سربمہر امانت رکھ دیا گیا ہے۔ تقسیم انعامات موصول شدہ حلوں کی تعداد کے مطابق بعد وضع اخراجات ہو گی۔ ایک سے زائد درست حل ہونے کی صورت میں صحیح حل کی رقم مساوی تقسیم کی جائیگی منیجر معمہ کا فیصلہ ہر حالت میں قطعی اور قانونی طور پر قابل تسلیم ہوگا۔ یہ اس معمہ کی واضح شرط ہے۔ وصول شدہ فیس کسی صورت میں واپس نہ ہو گی نتیجہ منگوانے کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال کریں

آخری تاریخ :- ۱۷ اگست ۱۹۳۸ء تک سب حل دفتر میں پہنچ جانے چاہیں۔ اسی روز شام کو ایک کھلے اجلاس میں اخبارات کے ایڈیٹروں، مقامی شرفا اور شامل ہونے والے ممبروں کی موجودگی میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ اگر آپ نتیجہ میں شمولیت کرنا چاہیں۔ تو خوشی کر سکتے ہیں۔ آپ آنے کی اطلاع ۱۷ اگست تک بھیج دیں۔ فیس شمولیت نتیجہ -/3 روپیہ ہوگی۔ انعامات ۲۳ اگست کو روانہ کئے جائیں گے۔

ترسیل فیس و حل کا پتہ

منیجر صاحب برٹش (انڈیا) بزنس کارپوریشن ۱ فاروق روڈ لاہور

مئی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات جامعہ

بیوہ - منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں۔ اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔
قیمت مجلد عہ

بنی اسرائیل کا چاند - معنفہ رائڈر ہیگرڈ، بترجمہ عبدالمجید حیرت بی اے علیگ۔ فرعون کا دور حکومت شاہزادہ سیٹی ولی عہد سلطنت کی عدل و انصاف کے لئے معزولی۔ عبرانیوں پر مظالم۔ ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے۔ مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی۔ فرعون کی مع لشکر غرقابی۔ اور سیٹی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان۔ قیمت مجلد عاں

ضرب الامثال - از خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی۔ یہ ۸۰ ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایسے ضرب الامثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کما حقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شایع نہیں ہوتی۔ قیمت ۸ر

دلی کی دو سو برس کی تاریخ - یہ اردو اکاڈمی کا ایک مقالہ ہے۔ اس میں تمام تر دلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے۔ اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ۔ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

عقاب - از رقیہ ریحانہ۔ یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔ ذرا ابوخاں کی بکری کو تو دیکھو یہ بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتی۔ لڑتے لڑتے مرجاتی ہے۔ لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا پسند نہیں کرتی۔
قیمت ۱۴ر

چنبیلی - یہ چھوٹے بچوں کے لئے آسان زبان میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ قیمت ۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد، اضلاع اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوئی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

کتاب	قیمت
رباعیات امجد حصہ اول	عمر
رباعیات امجد حصہ دوم	عمر
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجدی پیوند	عہ
نذر امجد	۱ر
حج امجد	عال
میاں بیوی کی کہانی	۴ر
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	ہے
گلستان امجد	ہے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد رضا صاحب ایم اے

کتاب	قیمت
ارباب نثر اردو	عال
گلشن گفتار	۱۲ر
فتوحات میر	عال
ابتدائی فارسی	۱۲ر
یادگار ولی	عال

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

کتاب	قیمت
ارمغان عزیز	عال
متاع سخن	۱۲ر

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

کتاب	قیمت
اردو کے اسالیب بیان	عمر
اردو شہ پارے	لعہ
روح تنقید	۱۲ر
تنقیدی مقالات	ہے
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عمر
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عال
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	عال
فن انشا پردازی	عمر
طلسم تقدیر	۸ر
سیر گولکنڈہ	۱۵ر
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲ر

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبد القادر صاحب سروری

کتاب	قیمت
دنیائے افسانہ	عمر
کردار اور شاعری	عمر
جدید اردو شاعری	عال
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶ر
انگریزی افسانے	عمر

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

کتاب	قیمت
خیالات آزاد جلد اول	سے
خیالات آزاد جلد دوم	عہ

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

کتاب	قیمت
یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	سے
خواتین عہد عثمانی	عمر
حضرت امجد کی شاعری	۱۲ر
مکتوبات امجد	۱۲ر
رہبر سفر یورپ	۱۲ر
ذکر نبی	۱۲ر

باہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد
مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا

اشاعت کتب ادارہ

گذشتہ سات سال کے عرصہ میں ادارہ نے حسب ذیل چند کتابیں شائع کیں۔

ورڈزورتھ اور اصلی شاعری :۔ از میر حسن صاحب ام' اے قیمت عہ

ٹیگور اور انکی شاعری :۔ از مخدوم محی الدین صاحب ام' اے قیمت عہ

ہوش کے ناخن (ڈرامہ) :۔ از میر حسن اور مخدوم محی الدین صاحبان قیمت ۱۲؍

یوسف ہندی قید فرنگ میں :۔ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی' اے' ال ال بی۔ قیمت ہ؍

مرقع سخن (جلد اول) :۔ دکن کے پچیس ۲۵ شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت ھہ؍

مرقع سخن (جلد دوم) :۔ مرقع سخن کا دوسرا حصہ ہے جس میں پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت ھہ؍

سراج سخن :۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

ایمان سخن :۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے۔ نے عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرا شیر محمد خان ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے ۱۲؍

فیض سخن :۔ میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور اسکے ساتھ ان کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۱۲؍

بادہ سخن :۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ قیمت ۱۲؍

کیف سخن :۔ حضرت کیفی ایک بوقلمون طبیعت کے سخن گو ہیں۔ ڈاکٹر زور نے کیف سخن کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات آفرین مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲؍

متاع سخن :۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر فصیح الملک داغ کے شاگرد اور حیدر آباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرے کے ساتھ ان کے کلام کا لطیف انتخاب پیش کیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

نقد سخن :۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطہ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔ قیمت عہ

نذر ولی :۔ اس میں دکن کی چار خواتین انشا پرداز کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت عا؍ ہر

گریہ تبسم :۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ میکش حیدر آباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور انکا کلام بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر زور کا دیباچہ عمومی اور پروفیسر عبدالقادر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ عا؍
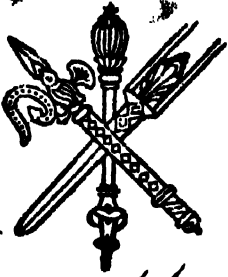
پارچہ
خوش نما
پائدار
سستا
کرناٹک، بکنگھم اور بنگلور اولن ملز کا
بنا ہوا کپڑا
قمیص، سوٹ اور شیروانی
کے لئے
مضبوط، خوش وضع اور کم دام ثابت ہوا ہے
(ہر کپڑے کی دوکان سے دستیاب ہوسکتا ہے)
بکنگھم ملز
BINNY & Co (MADRAS) LTD
AGENTS SECRETARIES & TREASURERS
بنگلور اولن ملز
کرناٹک ملز
یف ڈی - خاں - اینڈ کو
تاجر پارچہ

مکتبۂ ابراہیمیہ

حیدرآباد کا سب سے بڑا اور قدیم بک ڈپو ہے

مصنفین و مولفین

اپنی کتابوں کی

کتابت طباعت

تصاویر جلد بندی

اور

تشہیر و فروخت

شائقین علم و ادب

ہر علم و فن کی

کتابوں رسالوں

نقشوں خاکوں

اور

مختلف اداروں کی مطبوعات

کے لئے

مکتبہ ابراہیمیہ

عابد روڈ مصطفٰے بازار کی خدمات حاضر ہیں